الدین القیم

از علامہ مناظر احسن

نفیس اکیڈمی کراچی

Marfat.com

ذالک الدین القیم

الدین القیم

از

علامہ سید مناظر احسن گیلانی مرحوم

شیخ الحدیث وصدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی

نفیس اکیڈمی

اسٹریچن روڈ۔ کراچی۔ پاکستان

Marfat.com

جُملہ حقوقِ اشاعت وطباعت دائمی
سیّد عبدالرزاق مالک ادارۂ اشاعت اُردو مکتبۂ رزاقی کراچی
سے باقاعدہ قانونی طور پر حاصل کر کے

چوہدری محمدؐ اقبال سلیم گاھندری
مالک نفیس اکیڈمی اسٹریچن روڈ کراچی نے
شائع کیا

براہتمام ـــــ طارق اقبال گاھندری
طبع ہفتم ـــــ ۱۹۸۰ء
قیمت Rs. ـــــ

مطبوعہ

نفیس اکیڈمی آفسٹ پرنٹرز
کیمبل روڈ ـــــ کراچی

Marfat.com

فہرست عنوانات

دو لفظ از مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی بی اے	۹	فلسفہ کے ان اسکولوں کے اختلاف کی بنیاد	۳۱
دیباچہ از مصنف	۱۱	(۱) ثنویت	۳۲
فطرتِ انسانی کے مطالبات	۱۵	(۲) تصوریت	۳۳
مذہب کا سنگِ بنیاد	۱۵	(۳) مادیت	۳۳
بنیادی سوالات	۱۶	(۴) ارتیابیت	۳۴
مذہبی سوالات اور علوم عقلیہ	۱۸	مادیت اور مادہ	۳۸
مذہبی سوالات اور سائنس کی حد پہ دانہ	۱۸	علم اور وہم میں فرق	۳۸
ماہرینِ سائنس کا اعتراف	۱۹	انسان کے علمی ذرائع	۳۹
انسان صرف کچھ جان سکتا ہے وہ کسی چیز کی تخلیق و ایجاد پہ قادر نہیں	۲۰	عقل کا حواس سے تعلق	۳۹
	۲۰	مادہ کا محسوس ہونا ممکن ہے	۴۰
حکیم اور عامی میں فرق	۲۱	کانٹ کا مذہب	۴۱
سائنس اور مذہب کے حدود	۲۳	کیا مادہ ہمارے احساسات کی علت ہے۔	۴۲
مذہبی سوالات اور فلسفہ	۲۸	کیا مادہ محل اور موصوف ہے؟	۴۳
فلسفہ کے چار اسکول	۳۱	کیا مادہ حقیقت ہے؟	۴۴

Marfat.com

کیا یہ مذہبی سوالات فطرت انسانی سے
نکل سکتے ہیں؟ ۴۶
مذہبی سوالات کے حل کی فطری راہ ۴۸
وحی سے منقطع ہوکر جو خدا کو مانتا ہے ۴۹
وہ بھی وہم پرست ہے ۵۲
مذہب اور فلسفہ میں فرق ۵۲
ماننا اور جاننا ۵۴
سچے اور جھوٹے مذاہب میں امتیاز
کا معیار ۵۵
علم الکلام ۵۷
ایمان و معرفت، یا ماننا اور پہچاننا ۵۷
کلام کے معنی اور اس کا فائدہ ۶۰
پیغمبرانہ سیرت کے نمونوں کی راہ ۶۲
علم کلام کا فائدہ ۶۱
وجودِ باری ۶۳
خدا کی ذات ۶۴
خدا کی ذات کے متعلق چند فلسفیانہ
دلائل ۶۵
اثبات خدا کے متعلق مذہب کی راہ ۶۷
خدا کے خود بخود ہونے کا عقیدہ ۶۷
خود بخود ہونے والی ہستی کا انکار ۶۸
بھی اُس کا اقرار ہے
خداوند قدوس کی ہمیشگی ۷۱
آریائی روح و مادہ کا فالتو وجود ۷۱
توحید ۷۳
توحید کے سلسلہ میں قرآن کا لازوال ۷۵
اور لاجواب مطالبہ
اضداد کی باہمی آویزش اور ۷۶
مسئلہ توحید
مسئلہ صفات ۸۰
خدا پرستوں اور منکرین خدا
کے درمیان اختلاف کا حقیقی خط ۸۰
نابود کے نمود کا دعویٰ ۸۱
صفات کے متعلق قرآن کا
طریقہ خاص ۸۳
قانون تناسب کی خلاف ورزی ۸۵
قانونِ ترتیب سے چشم پوشی ۸۶
قوانین فطرت کے استحکام اور ۸۷

Marfat.com

ہمہ گیری سے غفلت ۸۵
خدا کے متعلق ایک اور سوال ۸۹
خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟ ۹۰
مسئلہ وحدۃ الوجود کی ایک عام فہم مگر
غیر صحیح توجیہہ ۹۲
بعض غلط تشریحیں اور تشبیہیں ۹۳
معاذ اللہ خدا غائب ۹۵
آریائی نظریہ اور اس کی لغویت ۹۶
اسلامی وحدۃ الوجود یا مسئلہ قیومیت ۹۸
قرآن کا خاص طریقہ ۹۹
اپنے خیالی عمل پر غور کرو ۱۰۰
کیا دماغوں میں تصویریں چھپنے کا سلسلہ ۱۰۲
جاری ہے؟
مسئلہ ربوبیت ۱۱۱
معجزات و خوارق کے متعلق ایک عام
غلط فہمی اور اس کا ازالہ ۱۱۲
چند اور ذیلی سوالات ۱۱۳
خدا نے عالم کو کس چیز سے پیدا کیا؟ ۱۲۰
مسئلہ لطائف و اسرار اور مسئلہ شق صدر ۱۲۹
حقیقت محمدیہ علی صاحبہا الف تحیۃ ۱۳۱
نبوت محمدیہ کے بعد نبوت کا سر ۱۳۴
دعویٰ فالتو نبوت کا دعویٰ ہے ۱۳۴
وحدت شہود اور مسئلہ شر کی توجیہہ ۱۳۵
شر کی توجیہہ میں بعضوں کے خیالات ۱۳۵
مسئلہ اقتضا ۱۴۱
غم اور اسباب غم یا مسئلہ شر کی
توجیہہ ۱۴۴
فطرت انسانی کا اقتضاء اور
اس کی تقدیر ۱۴۶
تعلیم بالتکلیف کا اقتضاء ۱۴۸
جذبۂ امانت ۱۴۹
قانون مجازات و مکافات ۱۵۱
"الجنۃ" ۱۵۲
"الجنۃ" کے متعلق مسیحی عقیدہ ۱۵۳
"النار" ۱۵۶
مسئلہ جبر و اختیار ۱۵۸
مقصد تخلیق، یا ابتلا بالعبدیت ۱۶۱
تدبیر کی حدود ۱۶۴

Marfat.com

دنیوی مصائب اور ان کے اسباب ۱۶۶
قانون تحویل و تخفیف ۱۶۸
قناعت و زہد ۱۶۸
دنیا کی متعدی سزا ۱۶۹
غم سے نجات کی راہ یا تسلیم و رضا ۱۷۱
توبہ و استغفار ۱۷۱
مسئلہ شفاعت ۱۷۲
مسئلہ شفاعت کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ ۱۷۲
رحمت کاملہ الٰہیہ کے اقتضاآت ۱۷۳
عبدیت کا کلی دستور اور اس کے نتائج ۱۷۴
مرضئ حق کی یافت کی قدرتی راہ ۱۷۶
اس سلسلہ کا ایک شدید مغالطہ ۱۷۸
محمد رسول اللہ پر ایمان لائے بغیر توحید کے مطالبات کی تکمیل ناممکن ہے ۱۷۹
خدا کی مطلوبہ توحید کا مطلب ۱۸۱
مسئلہ تبلیغ و مواخذہ کی ایک دشواری اور اس کا حل ۱۹۵
سوال میں پیچیدگی کی وجہ ۲۰۲
حضرت مجددؒ کا کشفی حل ۲۰۴
قرآن مجید کا عجیب اشارہ ۲۰۶
حضرت شیخ الہندؒ کا تحقیقی بیان ۲۱۴
ایک اور مسئلہ ۲۱۶

Marfat.com

نگاہِ اوّلین

محمّد اقبال سلیم گاھندری

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ دورِ حاضر کے ان مستند علمائے ربّانی میں سے ہیں جن کی طرف کسی تحریر کا انتساب اس کے اسناد کی پوری ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ اس علمی عظمت کے ساتھ مولانا کے علوم و فنون کا دائرہ اتنا وسیع ہے اور ہر پہلو پہ نظر اس قدر گہری ہے کہ جس موضوع پر وہ قلم اُٹھاتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسی خاص میدان کے شہسوار ہیں۔ چنانچہ حضرت مرحوم کی متنوع تصانیف ہمارے اس قول پہ گواہ ہیں۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں قرآن حدیث اور فقہ کی خدمات ضرورتِ حاضرہ کے مطابق نئے نئے اسلوب سے انجام دیں وہاں "علم کلام" بھی ان کے فیض سے محروم نہ رہ سکا لکھنے کو صرف ایک ہی کتاب اس موضوع پہ تحریر فرمائی اور وہ بھی کچھ ایسی ضخیم نہیں مگر اہل نظر کی نگاہ میں وہ جدید "علم کلام" کا شاہکار بن گئی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے قریبی ربط اور ان کے شکوک شبہات سے راست واقفیت نے مولانا کی خداداد صلاحیت کے بہتر سے بہتر ظہور کا موقع فراہم کر دیا۔ اسی لیے ان کی زبان و قلم سے جو جوابات عطا ہوئے، ان میں ندرت، اجاذبیت اور تسکین و تشفی کے سارے سامان موجود تھے چنانچہ وہ بے حد

Marfat.com

مقبول و موثّر ثابت ہوئے۔

دینیات لازم کے سلسلہ میں حضرت مولانا کے جو لکچرز کلامی مسائل پہ ہوتے رہے وہ بالآخر قلم بند ہو گئے اور ایک مختصر کتاب دریا بہ کوزہ کے مصداق "الدین القیم" کے نام سے منظرِ عام پہ آگئی۔ اس میں ربطِ خلق و خالق، مسئلہ خیر و شر، فلسفہ جبر و قدر اور تقدیر و تدبیر کی وضاحت اس شگفتگی اور سلاست سے آگئی ہے کہ یہ ناقابلِ حل مسائل بالکل عام فہم ہو گئے ہیں اور عقلی دلائل کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کی مطابقت جس بے تکلف انداز سے آگئی ہے وہ جامع العلوم حضرت گیلانی کا خاص حصّہ ہے۔

نفیس اکیڈیمی کو ابتدا ہی سے حضرت گیلانی کے قلمی افادیت کی اشاعت کا فخر حاصل رہا ہے، اور مولانا کی ضخیم ضخیم کتابیں اس کی طرف سے عام ہوتی رہی ہیں یہ مختصر کتاب سب سے پہلے مکتبہ الفرقان بریلی سے اور پھر حیدرآباد دکن سے چھپی تھی۔ مگر مدت سے ناپید ہو چکی اور تشنہ کامانِ علم اس کی تلاش میں سرگرداں تھے، اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے اس کی اشاعت کا قصد کیا۔ اور حتی الامکان عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ یہ خزانہ علمی وقف عام ہو رہا ہے۔

اُمید ہے کہ ہماری یہ سعی ناظرین کی تشفی اور حضرت مصنف رح کے سرورِ روحانی کا باعث بنے گی۔

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

دو لفظ

از مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی بی اے مدیر صدق لکھنؤ

جی میں تھا کہ "الدین القیم" پر کھُل کر لکھوں، کسی پر احسان رکھنے کی راہ سے نہیں، اپنے حق میں وسیلہ سعادت جان کر۔ دین قیمؒ کی خدمت کی راہ سے۔ حالات تکوینی پر قدرت کسے ہے کتاب کے مطبوعہ فرمے ایسے وقت ملے کہ:-

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

اتنی مہلت بھی نہیں کہ شروع سے آخر تک سرسری سہی، ایک نظر تو کتاب پر ڈال لوں! سارا تکیہ حافظہ کی وساطت سے پچھلے، بہت پچھلے مطالعہ پر۔ وقت کی اس تنگی کی تشریح کرنا چاہوں تو خود اس کے لیے وقت کہاں سے لاؤں!

کتاب کا مسودہ مدت ہوئی پڑھا تھا، اس کی افادیت، اس کی دل آویزی اس کی خوش تاثیری کا قائل اسی وقت ہو گیا تھا۔ دین کے اس زبردست خادم، وقت کے اس مشہور متکلم، موجودہ صدی کے اس ممتاز عالم کے قلم سے نکلی ہوئی کون سی چیز اس معیار پر اور اس پایہ کی نہیں ہوتی؟

Marfat.com

داد دینے کو دل مُصنّف کو نہیں چاہتا، وہ بحمد اللہ اس منزل سے کہیں آگے نکل چکے ہیں۔ مبارک باد پیش کرنے کو جی اُن حضرات کی خدمت میں چاہتا ہے جو اس کتاب کی طبع کا ذریعہ اور اشاعت کا باعث ہو رہے ہیں، اور جو اسے پڑھیں گے، اس کے مضامین سے مستفید ہوں گے، اس کی روشنی میں اپنے دین کو، ایمان کو، عقائد کو سنبھال لیں گے، سُدھار لیں گے، سنواریں گے۔

مولانا کو اس کتاب پر مفصل نظر ثانی کا مزید تشریح و توضیح کا اگر کہیں اور موقع مل گیا ہوتا۔ جب تو یہ کتاب خدا معلوم کیا سے کیا ہو جاتی۔ اب بھی جس صورت و ہیئت میں ہے انشاء اللہ بہتوں کے لیے شمع ہدایت کا کام دے گی، اور خدا معلوم کتنے گرتے ہوؤں کو سنبھال لے گی! ——— مسئلہ قومیت پر جو کچھ لکھا ہے، وہ تازگی فکر وندرت عنوان کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ مولانا جوں جوں آگے بڑھتے گئے ہیں، اُن کے قلم کے اصل جوہر کھلتے گئے ہیں ——— گھوڑ دوڑ میں کامیاب ہونے انھیں کو دیکھا ہے، جو شروع میں رفتار معمولی رکھتے ہیں اور پوری قوت دوڑ کی آخری ہی منزلوں پر دکھائی دیتی ہیں۔

ان کی ہر تحقیق میں قدامت کا استناد ہے اور ہر تعبیر میں جدّت کی تازگی، یہ عجیب حکیمانہ امتزاج ہے اور ان کی فضیلت کا طرۂ امتیاز!

"بلبل" کے لیے اگر "گل" کا ہم "قافیہ" ہونا کافی ہے۔ تو اس بے علم کے لیے بھی بس کرتا ہے کہ وہ اس پیکر علم کے ساتھ ہم ردیف ہو رہا ہے! وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

عبدالماجد ——— دریا باد ——— بارہ بنکی

۱۱ر فروری ۱۹۴۴ء

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

دیباچہ

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی

شاید اٹھارہ اُنیس سال ہوئے جب جامعہ عثمانیہ کی دینیات عام و لازم کے سلسلہ میں بی۔ اے کی جماعتوں کے لیے پنسل سے یادداشتوں کا یہ مجموعہ بطور تعلیمی نوٹ کے ارتجالاً مرتب کیا گیا تھا، سالہا سال تک یہ اسی شکل میں رہا، کچھ دن کے بعد ہمارے عزیز دوست مولوی غلام دستگیر رشید ایم اے پروفیسر نظام کالج نے بجائے پنسل کے روشنائی سے ان کو نقل کر کے مجھے دکھایا۔ بلکہ عزیز موصوف نے یہ فرماتے ہوئے کہ اس کو اپنے پاس رکھ لیجیے ایسا نہ ہو کہ ضائع ہو جائے توجہ بھی دلائی۔ پھر بھی میری توجہ اس کی طرف نہ ہوئی، لیکن ہمارے دوسرے کرم فرما مولوی سید احمد صاحب حیدرآبادی جنہوں نے خدا جانے میرے کتنے مُردہ مسودات میں خوش نویسی کی رُوح پھونک کر انھیں زندہ جاوید بنا دیا، مولوی غلام دستگیر رشید کے منقولہ مسودہ کو بھی مولوی سید احمد اپنے مبارک قلم سے صاف کر کے جب میرے پاس لائے حروف کے حسن و جمال نے مجبور کیا کہ خود اپنی لکھی ہوئی چیز کو دلچسپی کے ساتھ پڑھوں

Marfat.com

اُس وقت مجھے بھی محسوس ہوا کہ پنسل ہی سے سہی لیکن اس وقت جو کچھ حق تعالےٰ نے لکھوا دیا تھا وہ ضائع ہونے کی چیز نہیں تھی۔

بہت ہی خفیف نظر ثانی کے بعد اپنی اس پرانی یادداشت کو "الدین القیم" کے نام سے اپنے اس بزرگ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں جنہوں نے بہرحال یہ طے کر لیا ہے (داللہ متممٌ لغرائمہ) کہ میری فرمودہ چیزوں کو زندہ کر کے رہیں گے اس سے پیشتر "النبی الخاتم" صلی اللہ علیہ وسلم کے مسودہ کا احیاء بھی ان ہی کی توجہ خاص کا دست نگر ہے اور اب اسی سلسلہ کی یہ دوسری چیز "الدین القیم" کی زندگی بھی شاید قدرت نے اُن ہی کے لیے مقدر کی ہے جزاہ اللہ عنا دعن امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خیر الجزاء۔

میری مراد مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدیر الفرقان سلمہ الرحمٰن سے ہے۔ عافیت کے زاویہ سے بھڑکا کر ایک "محب العافیہ" رجل قعدہ کو اُٹھانا یہ اُن ہی کا کام ہے، ورنہ جس کا حال ؎

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میرؔ
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

کا مصداق ہو، یہ واقعہ ہے کہ سایہ دیوار کے نیچے سونے والے اس آرام طلب کو بیدار کرنا ایک سخت صبر آزما کام تھا۔

حضرت مجددؒ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہما کے متعلق جو کچھ بھی لکھا گیا وہ مولانا ہی کے شدید تعاقب کا نتیجہ تھا، اور آج بیس سال کی بھولی بسری باتیں اس کتاب کے ذریعہ سے نئی زندگی اگر حاصل کر رہی ہیں تو سراسر یہ اُن ہی کی توجہ

Marfat.com

خاص کا ثمرہ ہے ع

گر خار و گل ست ہمہ آوردۂ تست

پڑھنے والوں کو اس کا خیال کر لینا چاہیے کہ یہ ایک درسی یادداشت ہے، بڑی بڑی طویل بحثوں کو چند الفاظ میں بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ اجمال کی تفصیل طلبہ کے سامنے زبانی بیان کی جاتی تھی، صرف آخر کے چند اوراق جدید اضافہ کی نوعیت رکھتے ہیں اسی لیے ان میں آپ کو نسبتاً بسط کی کیفیت نظر آئے گی میں نے چاہا تھا کہ اسی یادداشت کے ساتھ اسلام کے عملی نظام کے اس خاکے کو بھی لکھ کر بڑھا دوں جو دروس عثمانیہ کا ایک جزٔ ہے اور لکھ بھی چکا تھا لیکن تحریر کا طرز اس میں بدل گیا۔ اس لیے صرف ان چند اوراق کے سوا جن کی حیثیت گویا اس کتاب کے مباحث کے خاتمہ کی ہے، عملی نظام والے حصہ کو الگ کر دیا، خیال ہے کہ "الدین القیم" حصہ دوم کے نام سے اسے بعد کو شائع کیا جائے واللہ ولی التوفیق۔

کتاب کے اس اجمال پر میں نے تنبیہ اس لیے ضروری خیال کی کہ مطالعہ کے وقت خاص طور سے قارئین کرام کے سامنے کتاب کی یہ خصوصیت رہے تقریباً "النبی الخاتم" کے متن متین کا جو حال تھا قریب قریب یہی کیفیت ان کلامی یادداشتوں کی بھی ہے۔

جہاں تک میں خیال کرتا ہوں اس کتاب سے اُن ہی لوگوں کو غالباً زیادہ نفع پہنچ سکتا ہے جنہوں نے "اسلام" کے اساسی امور پر غور و فکر میں عمر کا ایک حصہ بسر کیا ہے، کلام اور تصوف کی معتد بہ اور کافی کتابوں کا مطالعہ کر چکے ہیں، وہی خاکسار کی اُن حقیر کوششوں کی قدر و قیمت کا شاید صحیح اندازہ فرما سکتے ہیں کن کن خرمنوں سے یہ خوشے حاصل کیے گئے ہیں، شاید اس کی تفصیل اب میں خود بھی نہیں بتا سکتا۔

Marfat.com

بہرحال اب تو جو کچھ ہے وہ آپ کے سامنے ہے، ارباب نظر و انصاف سے ایک استدعا آخر میں یہ ہے کہ میری بعض جدید تعبیروں پر غور کرنے سے پہلے بھڑکنا نہ چاہیے کیونکہ بحمداللہ سلف صالح ما انا علیہ و اصحابی کے سوا، اسلام کے علمی نظام (عقائد) جس سے اس حصہ میں بحث کی گئی ہے، اس کی کسی دوسری توجیہ و تاویل کو میں حقیقی اسلام نہیں سمجھتا، اہل السنۃ والجماعت ہی کے عقائد پہ زندہ ہوں، اسی پہ مرنا چاہتا ہوں وبہ ادین یوم یقوم الناس بین یدی رب العالمین۔

المغرور بالامانی مناظر احسن گیلانی عفر اللہ ولمن رباہ
۲۱ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ
حیدرآباد دکن جوار الجامعۃ العثمانیہ

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم ؕ

فطرت انسانی کے مطالبات

مذہب کا سنگِ بنیاد

ماضی کی تلاش، مستقبل کی فکر، بشری فطرت کی ایک قدرتی بے چینی ہے، جوں جوں انسانی دل و دماغ بلند و بیدار ہوتے جاتے ہیں ان سوالات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے ایک تنگ خیال پست فطرت آدمی صرف اپنی ذات کے ماضی اور مستقبل کو سوچتا ہے، جو اس سے اونچا ہوتا ہے وہ اپنے خاندان کو بھی اس خیال میں شریک کرلیتا ہے۔ اسی طرح جو ان سے بھی عالی طبع ہوتے ہیں وہ نہ صرف خاندان بلکہ قوم و وطن کے متعلق بھی غور کرتے ہیں حتیٰ کہ فطرت انسانی کی بلندی کا ایک نقطہ وہ بھی ہے جہاں ذات و خاندان، قوم و جنس ہی نہیں بلکہ خود اس عالم کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کائنات کا یہ دریائے ناپیدا کنار جس کے ایک گوشے میں آفتاب و ماہتاب تنکے کی طرح تیر رہے ہیں اور فطرت کا یہ بحرِ ذخار جس میں ہر آن، ہر لحظہ کروڑوں ہستیاں اُگتی اور ڈوبتی رہتی ہیں آخر اس کا نقطۂ آغاز اور ابتدائی سرچشمہ کیا ہے؟ اور گنبد گرداں کے ان چکروں کا آخری انجام کیا ہوگا؟ انسان جب تک انسان ہے، جب تک اس کے کاسۂ سر میں جانوروں کا مغز نہیں بلکہ انسانی دماغ کی بلندی اور

Marfat.com

ذہنی وسعت باقی ہے یہ سوالات بھی باقی رہیں گے اور ان کو باقی رہنا بھی چاہیے کہ اس جستجو کے بغیر انسانی زندگی کا ماضی ومستقبل بجز تاریکی کے اور کچھ نہیں ہے آخر جس کا ماضی بھی تاریک اور مستقبل بھی اندھیرے میں ہو کیا وہ کہہ سکتا ہے کہ میں روشنی میں ہوں! کہاں سے آرہا ہے، کہاں جا رہا ہے جس مسافر کے لیے دونوں باتیں مجہول ہوں اس کے سفر کا انجام معلوم۔

اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝	کیا جو اوندھے منہ جا رہا ہے (نہ آگے کا حال اُسے معلوم نہ پیچھے کا) وہ سیدھی راہ پر ہے یا وہ جو کھڑا سیدھی راہ پر جا رہا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ گزشتہ اور آئندہ کے متعلق جتنی بلندی سے سوال اُٹھایا جائے گا اسی نسبت سے ہماری فطرت بھی بلند سے بلند تر ہوتی جائے گی، بلکہ سچ پوچھو تو اسی نسبت سے تاریکی بھی گھٹے گی اور روشنی بڑھے گی۔

بہرحال ہماری فطرت کے یہی دو مطالبے ہیں جو دراصل مذہب کے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان کے سوا اور بھی چند سوالات ہیں جو قریب قریب ان ہی دو سوالوں کی طرح ہماری فطرت کی گہرائیوں سے اُبلتے رہتے ہیں اور مذہب کی تعمیر میں اُن کو بھی بہت کچھ دخل ہے اب ہم ترتیب کے ساتھ چند اہم سوالات کو ذیل میں بیان کرتے ہیں:۔

بنیادی سوالات

(۱) عالم کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟
(۲) اس کا آخری انجام کیا ہوگا؟

Marfat.com

(۳) ہر چیز کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان کے کام آئے، پھر انسانی وجود کا کیا مقصد ہے ؟ لہ

(۴) کیا زندگی کی موجودہ کش مکش سے نجات کی کوئی صورت نکل سکتی ہے ؟

(۵) کیا بقائے دوام کی فطری خواہش مغالطی اور وہمی طور پر نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں پوری ہو سکتی ہے ؟

(۶) علمی اور عملی طور پر ہم میں ہر شخص غیر محدود ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ جو چاہوں کروں اور جو کچھ چاہوں جانوں، کیا فطرت انسانی کا یہ مطالبہ اپنے مقصد کو پا سکتا ہے ؟

یہی سوالات ہیں جن کے جواب کا نام مذہب ہے، یہی پیاس ہے جس کے پانی کی تعبیر دین سے کی جاتی ہے، یہی بھوک ہے جس کی خوراک صرف پیغمبروں کا پیغام

لہ بادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ آدمی تو دنیا کی چیزوں کے بغیر نہیں جی سکتا۔ آخر اگر ہوا نہ ہو، پانی نہ ہو، زمین نہ ہو، اس کی پیداواریں نہ ہوں، آفتاب نہ ہو، اس کی روشنی اور حرارت نہ ہو تو زمین کے اس کرّہ پر کیا چند لمحے بھی ہم گزار سکتے ہیں لیکن اس کے برخلاف اگر اس کی خاکدان ارضی سے انسانی نسل غائب ہو جائے تو آپ ہی خیال کیجیے کہ دنیا کی کس چیز کا کیا بگڑے گا ؟ سب ہمارے لیے ہیں اور ہم ان میں سے کسی کے لیے نہیں ہیں۔" یہ ایک بدیہی حقیقت ہے اسی پر یہ سوال مبنی ہے کہ پھر ہستی کے اس مضافات میں ہمارے وجود کے ساتھ قدرت نے کس مفاد کو وابستہ کیا ہے تفصیلی طور پر "الدین القیم" کے دوسرے حصہ میں اس پر مفصل بحث آئے گی ۱۲ منہ

Marfat.com

ہے اور ان ہی سوالات کا حل کرنا مذہب کی اصل غرض و غایت ہے۔

فطرت انسانی کی ان ہی بے چینیوں اور اضطرابات کی تصویر ڈاکٹر اقبال نے کتنے اچھے لفظوں میں کھینچی ہے۔

درونِ سینۂ ما سوزِ آرزو ز کجا ست | سبو زِ ماست ولے بادہ در سبو ز کجاست
گرفتم این کہ جہاں خاک و ما کفِ خاکیم | بہ ذرّہ ذرّہ ما درد و جستجو ز کجا ست

نگاہِ ما بہ گریبان کہکشاں افتد
جنوں ما ز کجا شور ہائے و ہو ز کجاست

مذہبی سوالات اور علوم عقلیہ

مذہب نے ان سوالات کو جن ذرائع سے حل کیا ہے اس کے بتانے سے پیشتر یہ دیکھنا چاہیے کہ مذہب سے کنارہ کش ہو کر کیا صرف عقلی علوم کی رہنمائی میں ہم ان سوالوں کو حل کر سکتے ہیں بحث کے لیے صرف اس سوال کو لو کہ

عالم کا نقطۂ آغاز اور انجام کیا ہے؟ کیونکہ اس کے حل ہو جانے کے بعد تقریباً دوسرے سوالات خود بخود حل ہو جاتے ہیں، اب آؤ اور عقلی علوم کی روشنی میں ان کا جواب ڈھونڈو۔

یوں تو عقلی علوم کی بہت سی شاخیں ہیں لیکن اجمالی طور پر ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک کا نام سائنس ہے اور دوسرے کو فلسفہ کہتے ہیں۔
پہلے ہم سائنس کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ ہماری کس حد تک مدد کر سکتی ہے۔

مذہبی سوالات اور سائنس کی حد پرواز

مذہب کے اس بنیادی سوال کو

Marfat.com

ئنس حل کر سکتی ہے یا نہیں اس کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ سائنس کی حد پرواز
کیا ہے۔ علماء سائنس نے اس علم کے حدود کو معین کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اُس کا
خلاصہ یہ ہے :۔

سائنس کی بحث وتحقیق کا تعلق تمام تر فطرت (NATURE) کے اُن واقعات
اور مشاہدات سے ہے جو ہمارے زیر تجربہ آسکیں لیکن جو چیزیں ہمارے احساس اور
مشاہدہ کے دائرہ سے خارج ہیں سائنس کو ان کے اقرار و انکار سے کچھ بحث نہیں۔

ماہرین سائنس کا اعتراف

پروفیسر لیتر جو فرانس کا مشہور ماہر سائنس ہے۔ لکھتا ہے :۔

" کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے اس لیے
ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں جس طرح
ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں، ہمارا کام نفی و
اثبات دونوں سے الگ رہتا ہے۔"

پروفیسر ٹنڈل نے اس خیال کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش
کی ہے۔ اگر تم گھڑی کو دیکھو، اُس میں گھنٹے منٹ سکنڈ کی سوئیاں
نظر آئیں گی، یہ سوئیاں کیوں پھرتی ہیں اور اُن کی حرکت کی باہمی نسبت
جو ہمیں نظر آتی ہے کیونکر قائم ہے، ان سوالات کا جواب بے گھڑی
کے کھولے اور اُس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور اُن کا
دوسروں سے تعلق قائم کیے بغیر نہیں دیا جا سکتا ہے، جب یہ سب
کچھ ہو لیتا ہے تو ہم کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سوئیوں کی یہ خاص حرکت

Marfat.com

گھڑی کی اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہے جو کوک کی قوت سے چل رہی ہے، سوئیوں کی یہ حرکت صنعت انسانی کا ایک کارنامہ ہے لیکن بجنسہ یہی حال واقعات و حوادث فطرت کا ہے عالم کی اس مشین کے اندر بھی ایک مخفی مشین کارفرما ہے اور ایک خزانۂ قوت ہے جو اس مشین کو چلا رہا ہے سائنس کا انتہائی کام اس مشین اور ذخیرہ قوت سے پردہ ہٹا کر یہ بتانا ہے کہ واقعات و حوادث ان ہی دونوں کے باہمی تعلق کا نتیجہ ہیں لیکن کارخانۂ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہے اور کیسے بنی اور اس گھڑی کو کس نے کوکا اور اس کی چلانے والی قوت کہاں سے آئی۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سائنس کے بس سے باہر ہے۔"

انسان صرف کچھ جان سکتا ہے، کسی چیز کی تخلیق و ایجاد پر قادر نہیں

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس نہ تو قدرتی قوانین کو ایجاد کرتی ہے نہ ان قوانین کی تمام کڑیوں کو سلجھا کر ہمارے سامنے پیش کر سکتی ہے بلکہ حوادث و واقعات کے محض اُن حلقوں کو ترتیب کے ساتھ ہمیں بتانے کی کوشش کرتی ہے جو اس کے دائرہ احساس و مشاہدہ میں آجاتے ہیں مثلاً وہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا نہیں کرتی بلکہ صرف یہ بتاتی ہے کہ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ جلاتی ہے وہ اسٹیم کو ایجاد (وجود بخشنا تخلیق کردن) نہیں کرتی بلکہ صرف اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتی ہے کہ جب آگ کا تعلق پانی سے ہوتا ہے تو یہ ایک قدرتی قانون ہے کہ وہ بھاپ بن جائے

Marfat.com

بہرحال ہمارے سامنے جو کچھ قدرتی قوانین پھیلے ہوئے ہیں ہم ان کو بنا نہیں سکتے بلکہ صرف جان سکتے ہیں اور سائنس اس پہ اتنا اضافہ اور کرتی ہے کہ اسی حد تک جان سکتے ہیں جس حد تک مشاہدہ ہمارا ساتھ دے گا لیکن یہ سوال کہ ان قوانین کا متعین کون ہے اُن کا نقطہ آغاز کیا ہے اور ان کا آخری انجام کیا ہوگا سائنس کے حدود سے اس کا جواب خارج ہے۔

ہکسلے نے سائنس کی اسی درماندگی کا اندازہ کرنے کے بعد بالکل سچ لکھا ہے کہ

"وہ کسی چیز کی بھی کامل توجیہہ نہیں کر سکتی اس کے سارے اسباب اوّل سے آخر تک نہیں بتائے جا سکتے کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ علم بھی توجیہہ میں آغاز اشیاء کی جانب چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

حکیم اور عامی میں فرق

بہرحال انسان کی انتہائی پرواز سائنس کے نقطۂ نظر سے صرف اس قدر ہے کہ کل نہیں بلکہ فطرت کے صرف ان قوانین کو وہ جان سکتا ہے جو حواس کی گرفت میں آجائیں، باقی رہا یہ سوال کہ جب صرف محسوس قوانین کی واقفیت تک عام انسانی پرواز ختم ہو جاتی ہے تو حکیم اور عامی میں کیا فرق رہا ؟ تو بات یہ ہے کہ گو عامی کا علم بھی مشاہدات اور محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حکیم بھی اس دائرہ کے آگے قدم نہیں رکھ سکتا، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ عامی آدمی کسی حادثہ یا منظر قدرت کو جب دیکھتا ہے تو وہ اس کے اثرات کو دُور تک نہیں لے جا سکتا، یعنی ایک جزئی واقعہ سے کلیہ نہیں بنا سکتا اور حکیم ایک جزئی واقعہ کو دیکھ کر چونکتا ہے اور یہ دیکھنا شروع کرتا ہے کہ آیا یہ واقعہ اسی جزئیہ تک محدود ہے یا آگے بھی بڑھ سکتا ہے ؟ پس اگر اس میں کچھ وسعت نظر آتی ہے تو چند جزئیات پہ منطبق کرنے کے بعد اسی جزئیہ کو وہ کلیہ کی شکل عطا

Marfat.com

کرتا ہے اور اسی کو قانون کے نام سے موسوم کرتا ہے، مثلاً نیوٹن نے سیب کو گرتے ہوئے دیکھا، اس طرح ہر شخص دیکھتا ہے لیکن وہ چونکا کہ آخر کیوں گرتا ہے اس کو محسوس ہوا کہ زمین کی کشش کا نتیجہ ہے، اب اس کشش کی خاصیت کو اس نے دوسری چیزوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا بالآخر اس نے اعلان کیا کہ فضا میں جتنے کرتے تیر رہے ہیں وہ سب جذب و کشش ہی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، بہرحال نیوٹن نے فضائی کرّوں کی خاصیت کا ایک علم حاصل کیا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان کرّوں کا موجد تھا یا اس نے اُن میں جذب و کشش کی خاصیت پیدا کر دی تھی، جو قانون پہلے سے موجود تھا صرف اس کا علم اس نے حاصل کیا اس سے زیادہ نہ اُس نے کچھ کیا نہ کر سکتا تھا وہ خود کہتا ہے:۔

"عالم فطرت کی یہ نیرنگیاں (جذب و کشش) واجب الوجود کے ارادہ کے سوا اور کسی شے سے ظاہر نہیں ہو سکتیں وہ واجب الوجود جو ہر جگہ اور ہمیشہ موجود ہے۔"

اور یہی حال سائنس کے تمام مسائل اور اختراعات کا ہے۔ بھاپ سے کیتلی کے ڈھکنے کو اُٹھتے ہوئے سب ہی دیکھتے ہیں جس طرح اسٹیفن نے دیکھا لیکن اسٹیفن نے اس جزئی مشاہدہ سے ایک کلیہ پیدا کیا اور اس کلیہ کو فطرت کے دوسرے قوانین مثلاً لوہے کی لچک، پہیوں کی گردش، اسی قسم کے میکانکی قوانین کے علم کے ساتھ وابستہ کر دیا اُس نے اپنے کسی پیدا کردہ قانون کو نہیں بلکہ قدرتی قوانین کو اس شکل میں نمایاں کیا ہے جسے ہم ٹرین کہتے ہیں۔

Marfat.com

الغرض صنعت وحرفت والے قدرتی قوانین کے جزئیات سے کلیات کا علم حاصل کرتے ہیں لیکن کسی چیز کی ایجاد (یعنی اس کو وجود بخشنا) ایک غریب انسان کے بس کی بات نہیں وہ فقط "علّم آدم الاسماء کلھا" (سکھایا اللہ نے آدم کو سارے اسماء) کے اجمال کی تفصیل کر سکتا ہے اور یہی اسے دیا بھی گیا ہے۔

سائنس اور مذہب کے حدود

الحاصل جب سائنس کا سارا زور مشاہدات اور محسوسات پر ختم ہو جاتا ہے تو خود اندازہ کرو کہ جن سوالات پہ مذہب کی بنیاد قائم ہے مثلاً عالم کا نقطۂ آغاز کیا ہے جیسا کہ ہکسلے نے کہا تھا کہ سائنس کا قدم آغاز اشیاء کی جانب چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، تو پھر آخری نقطہ تک اس کی رسائی کیونکر ہو سکتی ہے۔

پس سچ یہ ہے کہ سائنس جہاں اپنی تحقیقات ختم کر دیتی ہے مذہب وہیں سے اپنا درس شروع کرتا ہے، سائنس صرف عالم شہادت (عالم محسوس کے چند واقعات محسوسہ کو کلیات کی شکل میں پیش کر کے اپنے بازو ڈال دیتی ہے، محسوسات کے آگے قدم رکھتے ہی اس پہ رعشہ طاری ہو جاتا ہے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ آگے کیا ہے۔ اور مذہب انسان کا یہیں سے ہاتھ پکڑتا ہے اور غیب (عالم غیر محسوس) کے سارے اسرار کو اس کے سامنے بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے، سائنس کچھ نہیں بتا سکتی کہ دنیا کی ابتدا کیونکر ہوئی، مذہب آتا ہے اور اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔ انسان مرنے کے بعد کہاں جاتا ہے اور اس پہ کیا گزرتی ہے؟ سائنس اس کے جواب سے عاجز ہے اور مذہب اس کی تفصیل پیش کرتا ہے، دنیا کا آخری انجام کیا ہوگا؟ سائنس متحیر ہے کہ اس کا کیا جواب دے، مذہب آتا ہے اور اس

Marfat.com

حیرت کو مٹا دیتا ہے۔

سائنس یہ تو بتاتی ہے کہ عالم کس کے لیے ہے، لیکن خود انسان کس کے لیے ہے اس مقصد کو متعین کرنے سے وہ عاجز ہے، مذہب آتا ہے اور اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیتا ہے۔ الغرض مذہب کا جس عالم سے تعلق ہے سائنس کی ہدایت کا چراغ اس کے حدود تک پہنچتے ہی گل ہو جاتا ہے۔ میلن ایڈورڈ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کہ

"عالم کے ان قوانین کی نسبت یہ کہنا کہ یہ محض بخت و اتفاق کے نتائج ہیں، یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں ہیں جسے لوگوں نے محسوسات کا لقب دے رکھا ہے فزیکل سائنس جاننے والا ہرگز اس قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ (بحوالہ الکلام مولانا شبلی)

اس کے بعد عوام الناس کا یہ خیال کہ سائنس کی جدید تحقیقات نے مذہب کی بنیادیں ہلا دی ہیں، جیسا کہ گنیزو نے غایت گستاخی کے ساتھ لکھا ہے کہ "ہم نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کر کے اس کو سرحد پار پہنچا دیا۔" (نعوذ باللہ تعالیٰ شانہٗ) کس درجہ جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے۔ کسی[1] نے خوب کہا ہے کہ

---

[1] میری مراد مولانا عبدالباری ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ سے ہے مولانا نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ سورت میں ایک مقالہ "دینیات اور عقلیات" کے عنوان سے پڑھا تھا یہ رسالہ کانفرنس کی طرف سے شائع بھی کر دیا گیا ہے، ارباب تحقیق نے باوجود اختصار کے اس مقالہ کی کافی ستائش کی، حضرت مولانا تھانویؒ نے تو دین و بے دینی کے درمیان سد آہنی اسی رسالہ کو قرار دیا ہے۔ خاکسار نے بھی اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں مولانا کے اس مقالہ سے کافی نفع اٹھایا ہے۔ بلکہ مغربی مصنفین کے اقوال جو اس حصہ میں درج ہیں ان کی معقول تعداد مولانا ہی کے مضمون سے نقل کی گئی ہے۔ ۱۲ منہ۔

Marfat.com

" اگر خشکی کی ٹرین سمندر کے جہاز سے ٹکرا سکتی ہے تو سائنس بھی مذہب سے ٹکرا سکتی ہے ۔"

مطلب یہ ہے کہ جب دونوں کے حدود جُدا جُدا ہیں ایک کی تگ و دو محسوسات کے تنگ دائرہ تک محدود ہے اور دوسرا غیبی فضا کا شہباز ہے تو ان دونوں میں تصادم کا کیا مطلب ہو سکتا ہے ۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ سچ فرماتے ہیں ؎

عاقلاں نقطۂ پرکار وجود اند ولے
عشق داند کہ دریں بادیہ سرگرداں اند

خلاصہ یہ ہے کہ سائنس اور مذہب بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں نہ ان دونوں میں اختلاف ہے اور نہ ہو سکتا ہے ہم سائنس کے ذریعہ آسمان کے تاروں کو گن سکتے ہیں آفتاب کو ناپ سکتے ہیں، ہوا کو تول سکتے ہیں، سمندر کو خشک کر کے بادل بنا کر پانی برسا سکتے ہیں بلکہ ممکن ہے کہ آئندہ مُردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہو جائے جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ" احیاءِ موتی[1] " (مُردے کو زندہ کر دینے) پر بھی آدمی قادر ہو جائے گا بلکہ زندہ کرے گا دوسرے لفظوں میں اسی کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ:-

---

[1] دجّال کی حدیثوں میں اس کا ذکر ہے کہ منجملہ اور باتوں کے وہ مُردے کو بھی زندہ کرے گا ۔ حدیثوں کا صحیح ذخیرہ دجّال کی اس خصوصیت کے ذکر سے معمور ہے بلکہ دجال کی یہ خصوصیت کہ چالیس دن کی مختصر مدت میں کرۂ زمین کے شمال و جنوب مشرق و مغرب کی ہر آبادی میں پہنچ جائے گا یعنی بُعد مسافت کے مسئلہ کو گویا درجہ صفر تک پہنچا دے گا۔ یا مون سون پر قابو یافتہ ہو کر جہاں چاہے گا پانی برسائے گا آپ اگر غور کریں گے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

Marfat.com

"انسان زندگی کے قانون سے کبھی واقف ہو جائے گا۔"

اور سائنسدانوں کا بھی بیان ہے کہ ہم نے "تخم حیات" (پروٹوپلازم) کا پتہ چلا لیا ہے، کیمیا والے کہتے ہیں کہ تخم حیات کاربن آکسیجن، نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے تیار ہوتا ہے۔ تو سائنس یہ سب کچھ کر سکتی ہے اور ہم منتظر ہیں کہ وہ ایسا کرے کیونکہ ہمارے بہت سے ایمانی دعوؤں کی توثیق انھیں انکشافات پر موقوف ہے لیکن بایںہمہ مذہبی سوالات کے حل میں سائنس اس طرح عاجز رہے گی جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے۔ فرض کیجیے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا کر بھی لیا تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ زندگی کا راز کسی زمانہ میں یوں حل کیا گیا تھا کہ نر و مادہ کے باہمی اختلاط کا یہ نتیجہ ہے۔ لیکن اس وقت بھی یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس اختلاط سے یہ نتیجہ کیوں پیدا ہوتا ہے، اب یہ سوال اسی طرح باقی رہے گا کہ کاربن آکسیجن ہائیڈروجن نائٹروجن کی باہمی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ کیا جو شخص اس سے واقف ہے کہ تخم کو مٹی میں ملانے اور پانی دینے سے پودا پیدا ہو جاتا ہے۔ کیا اس نے اس سوال کو حل کر لیا کہ پودا کیونکر پیدا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) سائنس کے رجحانات ان چیزوں کی تکمیل کی طرف ہیں، ریل، موٹر، ہوائی جہاز، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ کا حاصل بُعد مسافت کی کمی کے سوا اور کیا ہے بارش برسانے کی جدوجہد بھی سُنا جاتا ہے کہ سائنس کی دنیا میں جاری ہے پھر کیوں نہیں کہا جا سکتا کہ سائنس کا انتہائی عروج ممکن ہے کہ دجال ہی کے ہاتھوں پر مقدر ہو۔

Marfat.com

ہوتا ہے؟ پروفیسر ٹنڈل نے بلفاسٹ کے لکچر میں ایک موقع پر کتنی اچھی بات کہی کہ

"لیکن کیوں؟ اس کا جواب ہمیشہ کے لیے اسی طرح ناممکن رہے گا جس طرح کہ پہلے رہا ہے۔"

امجد حیدر آبادی نے بھی اس مضمون کو ایک شعر میں ادا کیا ہے ؎

امجد ہر بات میں کہاں تک کیوں کیوں ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

الحاصل کسی شئے کے آغاز کا پتہ چلانا اور اس کے آخری انجام تک پہنچنا سائنس کی رہنمائی میں ناممکن ہے، چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، علی الخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی حال انجام کا ہے آئندہ کیا ہوگا، موجودہ قوانین کا آئندہ کیا حال ہوگا، ان کے آثار و نتائج کیا ہوں گے؟ اس کا بھی کوئی قطعی جواب سائنس نہیں دے سکتی وہی ہکسلے جس نے آغاز کے متعلق انسان کے جاہل ہونے کا اقرار کیا تھا اب انجام کے متعلق بھی اسی اعتراف کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"عالم تو بڑی چیز ہے سائنس کا معمولی قانون یہ ہے کہ جو پتھر بے سہارا ہوگا اس کو زمین پر گر پڑنا چاہیے لیکن ہمیشہ کیا یہی ضرور ہوگا۔"

اس کے نزدیک یہ قانون قدرت نہیں بلکہ انسان کا وہمی اضافہ ہے اُس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

"وہ ڈراؤنا لزوم اور ضروری ہونے کا قانون کیا ہے؟ جس نے لوگوں کو اس قدر خائف اور وحشت زدہ بنا رکھا ہے، سچ پوچھو تو یہ ہمارے واہمہ کا ایک گھڑا ہوا بھوت ہے، سائنس ہی کا یہ قانون

Marfat.com

ہے کہ پتھر جب بے سہارا ہوگا تو اس کو زمین پر گر پڑنا چاہیے لیکن آئندہ وہ ہمیشہ گر ہی پڑے گا یعنی اس کے خلاف ہونا ناممکن ہے یہ ایک ایسی زائد شے کا اضافہ ہے جس کا نہ تو مشاہدہ اور واقعات میں نشان ملتا ہے اور نہ کہیں اس سے کا پتہ چلتا ہے۔"

(ماخوذ از فزیکل بلسس آف لائف)

یعنی یہ ایسا حکم ہے جس کی شہادت ہمارے حواس نہیں دیتے۔

سائنس کی یہ رائے تو انجام کے متعلق تھی رہا آغاز اس کے متعلق میں نے چند اقوال پہلے بھی درج کیے ہیں لیکن آخر میں ہکسلے ہی کے قول کو پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

وہ اپنی کتاب "اصول و نتائج" میں لکھتا ہے:۔

"وجود کی علت اولی کا مسئلہ میرے حقیر قویٰ کی دسترس سے باہر ہے جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا ان میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں جو آغاز عالم کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں مگر ان لوگوں کے مہملات ان سے بھی زیادہ بڑھ جاتے ہیں جو یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں ہے۔"

مذہبی سوالات اور فلسفہ مذہب جن سوالات کو حل کرتا ہے میں نے بتایا ہے کہ ان میں اہم ترین سوال عالم کے آغاز و انجام ہی کا تھا، باقی سوالات انھیں دو سوالوں کی ذیلی اور تفصیلی شکلیں ہیں، سائنس تو یہ کہہ کر اکھاڑے سے نکل گئی کہ ان سوالات کا تعلق غیب سے ہے اور ہماری

Marfat.com

بحث کا دائرہ چونکہ صرف محسوس قوانین تک محدود ہے اس لیے غیر محسوس قوانین کے سوالوں کا جواب ہمارے فرائض میں داخل نہیں اب فلسفہ کی اونچی دوکانیں سامنے آتی ہیں آؤ ذرا ان کی بھی سیر کر لیں۔

سُنا جاتا ہے کہ اس علم میں محسوسات کی چار دیواریوں کو پھاند کر محسوس قوانین کے دائرہ سے نکل کر ان امور کا بھی پتہ چلایا جاتا ہے جو مشاہدہ اور تجربہ کی گرفت سے باہر ہیں اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے، فلسفہ کے شعبہ مابعد الطبیعات (مٹیا فزکس) والوں نے ان سوالات کو بھی چھیڑا ہے جن کی گرہ کشائی کا محض مذہب حق دار تھا اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی علم سے اگر مذہب کی ٹکر ہو بھی جاتی ہے تو وہ محض فلسفہ ہے، بلکہ فلسفہ کی صرف ایک شاخ مابعد الطبیعات، ورنہ ظاہر ہے کہ تاریخ، ریاضی، ہندسہ، کیمیا، طب اور دیگر میکانکی علوم یا صنائع نے نہ کبھی مذہب کے میدان میں قدم رکھا اور نہ کبھی اُن سے مذہب کو اختلاف ہوا، صرف فلسفہ ہی ایک ایسا علم ہے جس میں غیبی حقائق اور مذہبی امور کو عقلی گرفت میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کوشش میں کبھی کبھی وہ مذہب سے متصادم ہو جاتا ہے یہی معمولی تصادم ہے جس کی بنیاد پر اس زمانہ میں ہنگامہ بپا کر دیا گیا کہ علم نے مذہب کی بنیادیں ہلا دیں، حالانکہ میں بتا چکا کہ اگر "علم" سے مراد مابعد الطبیعات کے سوا کوئی اور علم ہے تو اس سے زیادہ بے بنیاد، گندہ اور فربہ جھوٹ ممکن نہیں اور اگر صرف مابعد الطبیعات مراد ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک حد تک درست ہے لیکن فلسفہ کے نادان مرید اپنے پیروں کو جتنی بلندی پہ لے جا کر اڑانا چاہتے ہیں واقعات بتائیں گے کہ وہ قطعاً اُس کے مستحق نہ تھے۔

Marfat.com

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مابعد الطبیعیات میں جن امور کے متعلق رائے قائم کی جاتی ہے چونکہ اُن کا تعلق مشاہدات اور تجربات سے نہیں ہوتا اس لیے کچھ قیاسات اور تخمینے، ظنون اور اندازے ہوتے ہیں جن کے بل پر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ ان رایوں میں اختلاف اور شدید اختلاف پیدا ہو جائے، ہر شخص اپنی دماغی خصوصیت، موروثی اثرات اور ماحول کے غیر شعوری تاثرات کے تحت ایک تجویز پیش کرتا ہے جو دوسرے سوچنے والوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے ۔ اس کا صحیح اندازہ فلسفہ کی تاریخ پڑھنے سے ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند اندھے ہیں جو آنکھ سے ہاتھی کو دیکھ نہیں سکتے اور صرف چھو کر اس کی شکل و صورت کے متعلق رائے قائم کر رہے ہیں۔ ہر ایک نئی مثالوں اور جدید تشریحوں کے قالب میں اپنے نتائج کو ڈھال کر پیش کر رہا ہے گویا ؎

صورت نادیدہ را تعیین بہ تخمین کردہ اند

بہرحال یہ آپس میں جتنا چاہیں اُلجھیں مجھے اس سے کیا بحث میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ فلسفہ اور مذہب کے اختلاف کا بظاہر اس زمانہ میں بڑا ڈنکا پیٹا جا رہا ہے دیکھیں تو سہی اس طبل بلند بانگ کے اندر بھی کچھ ہے ؟

Marfat.com

فلسفہ کے چار اسکول

فلسفیوں کے اُن تمام اختلافات کو پیشِ نظر رکھ کر اس زمانہ میں فلسفہ کو چار اسکولوں
میں تقسیم کیا گیا ہے اب آؤ اور دیکھو کہ ان اسکولوں میں کتنے ایسے اسکول ہیں جنہوں نے
مذہب سے پنجہ آزمائی کی کوشش کی ہے۔ یوں تو کہنے کو بہت کہا جاتا ہے۔ لیکن واقعہ
یہ ہے کہ ان چار اسکولوں میں سے صرف ایک اسکول ایسا ملے گا جس کو مذہب کا صحیح معنوں
میں حریف اور مدِ مقابل کہا جا سکتا ہے ورنہ اس کے علاوہ دو اسکول صرف یہی نہیں کہ
مذہب کے وہ مخالف ہیں نہیں بلکہ اس کے حامی اور مددگار ہیں اور تیسرا اسکول ایسا
ہے جو اگر موافق نہیں ہے تو اس کو مذہب کی مخالفت سے بھی کوئی سروکار نہیں، ذیل
میں ہر ایک اسکول کے اصولی نقطۂ نظر کو بیان کر کے بتایا جائے گا کہ اُن کا مذہب پر
کیا اثر پڑتا ہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ اُن فلسفیانہ مذاہب کا تذکرہ کیا جائے یہ معلوم کر لینا چاہیے
کہ فلسفہ کے اُن مکاتبِ خیال کے اختلاف کی بنیاد ہے؟

فلسفہ کے ان اسکولوں کے اختلاف کی بنیاد

بات یہ ہے کہ عالمِ محسوس
جس میں عناصر جمادات

Marfat.com

نباتات حیوانات سب شریک ہیں مجموعی حیثیت سے غور کرنے کے بعد ان میں دو قسم کے صفات نظر آتے ہیں، حیاتی اور غیر حیاتی مثلاً طول، عرض، عمق، رنگ، شکل، وزن، روشنی حرکت، حرارت، برودت وغیرہ صفات ہیں یعنی ان کو زندگی کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہیں، مُردہ اور زندہ ہر قسم کے موجودات میں یہ صفات ہیں جنہیں ہم بغیر زندگی کے سوچ ہی نہیں سکتے۔ اسی لیے ان کا نام حیاتی صفات ہے اب عالم محسوس کی آن ہی دو مختلف قسم کی صفات کو سامنے رکھ کر متفرق سوچنے والوں نے مختلف رائیں قائم کیں۔ ان ہی رایوں کو اجمالی طور پہ چار اسکولوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

ثنویت (۱) فلسفہ کا پہلا اسکول ثنویت کا ہے اس کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ صفات و آثار کے یہ دو مختلف مظاہر (حیاتی و غیر حیاتی) چونکہ باہم ایک دوسرے سے بالکل جُدا ہیں اس لیے ان دونوں کے سرچشموں کو بھی علیحدہ ہی ماننا چاہیے اسی بنا پہ انھوں نے عالم کی بنیاد دو چیزوں پہ قائم کی۔

ایک روح یا خدا جو حیاتِ مطلق ہے اور عالم کے سارے حیاتی صفات مثلاً ادراک اور علم و ارادہ وغیرہ کا وہی منشا و مرجع ہے۔ دوسرا مادہ جو کائنات کے تمام غیر حیاتی کا مصدر اور سرچشمہ ہے۔

یہ وہ خیال ہے جس کی ابتدا ارسطو سے مانی جاتی ہے۔ متاخرین میں ڈیکارٹ تک فلسفیوں کا بڑا گروہ فلسفہ کے اسی مکتب خیال کا پیرو ہے۔

فلسفہ کے اسکولوں میں جب خدائے زندہ و قادر کا کھلے لفظوں میں اقرار کیا جاتا ہے اور خدا ہی پہ مذہبی ایوان کے سارے ستون مثلاً عبادت اخلاق، سزا و جزا حشر و نشر وغیرہ قائم ہیں تو اس اسکول کو نفس مذہب کی مخالفت سے ظاہر ہے کیا

Marfat.com

...رو کار ہو سکتا ہے۔

تصوریہ (۲) فلسفہ کا دوسرا اسکول تصوریہ کا ہے ان کا خیال ہے کہ جس طرح حیاتی صفات کا سرچشمہ خدا یا روح ہے اسی طرح غیر حیاتی صفات بھی اسی کی جلوہ آرائیوں کا نام ہے، یہاں کچھ نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ صرف روح (یعنی خدا) کے مختلف صفات کا ظہور مختلف حیثیتوں سے ہو رہا ہے۔ الغرض ان لوگوں کے نزدیک مادہ ایک بے معنی سی چیز ہے یعنی صرف روح یا خدا اور اس کے مختلف جلوے ہیں۔ اس خیال کی ابتدا افلاطون سے ہوئی اور کسی نہ کسی شکل میں اس زمانہ کے تمام سربرآوردہ فلاسفہ برکلے سے لے کر برگسان تک اسی خیال کی تائید پہ مصر ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب اس مسلک میں خدا کا اقرار اتنی بلند آہنگیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسری چیز کا ماننا بھی انہیں گوارا نہیں تو فلسفہ کے اس اسکول کو بجائے دوست کے مذہب کا دشمن کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

...یت (۳) ان لوگوں کا خیال تصوریہ کے بالکل برعکس ہے ان کا دعوےٰ ہے کہ جس طرح غیر حیاتی صفات کا سرچشمہ ارسطو وغیرہ کے نزدیک مادہ ہے اسی طرح حیاتی صفات بھی در اصل مادہ ہی کی ایک شان ہیں۔

مادہ اپنی ابتدائی حالت میں صرف طول و عرض، نرمی و سختی وغیرہ کی صفات سے موصوف تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں نت نئے صفات کا اضافہ ہوتا رہا پہلے نشو و نما و بالیدگی کی صفت پیدا ہوئی اور یوں ہی بڑھتے بڑھتے ایک درجہ مادہ کا وہ بھی ...کہ اس میں ذہن ادراک، شعور، تخیل، ارادہ، تعقل وغیرہ صفات پیدا ہو گئے ...رض یہ سارے صفات براہ راست مادہ ہی کے ہیں، حیات، زندگی، روح،

Marfat.com

یہ سب الفاظ بے معنی ہیں، ان کے نزدیک یہاں کچھ نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہے صرف مادہ ہے، جمادات سے لے کر انسان تک جن مظاہر و آثار کا ظہور ہو رہا ہے یہ سب مادہ ہی کی مختلف نیرنگیاں ہیں۔

الغرض فلسفہ کے اس مکتب فکر میں عالم کا سرچشمہ ایک بے حس و بے جان مُردہ کو مانا جاتا ہے۔ اس خیال کی بنیاد آج سے تقریباً ڈھائی تین ہزار برس بیشتر حکیم دیمقراطیس نے رکھی ہے اور اس وقت تک یورپ کے جن لوگوں کو مسلک مادیت پر اصرار ہے وہ دیمقراطیس ہی کے خیالات کی آواز بازگشت ہے۔

بلاشبہ فلسفیانہ مکاتب خیال میں یہی ایک ایسا مسلک ہے جسے مذہب کا صحیح معنوں میں حقیقی حریف و مدمقابل قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اسی میں خدا کو ہٹا کر اس کی جگہ مادہ کو تخت نشین کرنے کی کوشش (العیاذ باللہ) کی گئی ہے اس گروہ کا یہ اعلان ہے کہ مادہ اور قوانین مادہ نے عالم کو پیدائش کے مسئلہ سے بے نیاز کر دیا۔ یعنی اب اس کو کسی خالق کی ضرورت نہیں رہی۔ اسی مسلک کی ایک تعبیر یہ بھی ہے کہ مادہ ہی مادرِ کائنات ہے جو خود اپنے رحم سے نتائج برآمد کرتی رہتی ہے۔

ارتیابیت (۴) یہ فلسفہ کا چوتھا اسکول ہے، ارتیاب کے معنی شک کے ہیں اس لفظ کی طرف منسوب کر کے اس مسلک کا نام "ارتیابیت" رکھا گیا ہے۔ ان بے چاروں نے فلسفہ کی ان ہنگامہ آرائیوں کو دیکھ کر اپنی پناہ گاہ اعتراف جہل و اقرار عجز کے سایہ میں بنائی ہے یہ کہتے ہیں کہ ہم کو کچھ نہیں معلوم کہ اس عالم محسوس کا اصلی سرچشمہ کیا ہے مادہ ہے یا خدا ہے، اُن کا بیان ہے کہ چونکہ یہ باتیں ہماری سرحدِ ادراک سے باہر ہیں، عقل انھیں اپنی گرفت میں نہیں لا

Marfat.com

سکتی۔ اس لیے اس پہ بحث ہی فضول ہے، نظریہ میں ہم خدا اور مادّہ دونوں کے اقرار وانکار سے علیحدہ رہتے ہیں ان ہی لوگوں کا نام ادریّا بی ہے۔ اگرچہ یہ مسلک بھی قدیم ہے لیکن پچھلے دنوں یورپ میں ہیوم اسپنسر ہکسلے وغیرہ نے اس مسلک کو فروغ دیا۔

اب تم اندازہ کرو کہ فلسفہ کے اس اسکول کا بھی مذہب پہ کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس مسلک سے مذہب کی تائید نہیں ہوتی لیکن تردید بھی تو نہیں ہوتی، ہم اس مسلک کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ ثنویت اور تصوریت کی طرح اگر یہ مذہب کا دوست نہیں ہے تو مادیت کی طرح دشمن بھی نہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ لوگ جنہوں نے یہ جان کر کہ غیبی حقائق تک عقل وحواس کے ذریعہ سے رسائی نہیں ہو سکتی گویا عملاً مذہبی راہنماؤں کی ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے، صاف لفظوں میں اس کا اعلان نہ کریں لیکن بقول شخصے[1]

"چشم وابرو کے اشارہ سے اقرار پنہاں ٹپکا پڑتا ہے۔"

ہکسلے کے قلم سے اپنے مجموعہ مضامین کی چھٹی جلد میں (جو ہیوم پہ ہے) یہ جملہ بے ساختہ نکل گیا۔

"اگر مجھ کو خالص مادیت اور خالص تصوریت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا ہی پڑے تو میں تصوریت کو قبول کرنے پہ مجبور ہوں گا۔"

بہرحال اوپر کی تفصیل سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا کہ فلسفہ اور مذہب کی جنگ عوام الناس کے جاہلانہ خیالات کا نتیجہ ہے۔ عموماً اس کے مدعی وہی لوگ ہیں جو فلسفہ

---

[1] یعنی مولانا عبدالباری ندوی

Marfat.com

اور مذہب دونوں سے ناواقف ہیں ورنہ سچی بات وہی ہے جو بیکن سے منقول ہے کہ

"فلسفہ کا قلیل اور سطحی علم، الحاد کی طرف مائل کر دیتا ہے لیکن اس کا گہرا علم مذہب سے قریب اور قریب تر کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔"

(مضمون "دہریت" مندرجہ مضامین بیکن صفحہ ۱۴۸ کالنز پاکٹ کلاسکس)

بہر حال ٹھیک۔ جس طرح مذہب اور سائنس کی جنگ ایک گپ اور افسانہ پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی قریب قریب یہی حال فلسفہ اور مذہب کی باہمی آویزش کی داستان کا بھی ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا تھا کہ سائنس کے حدود میں نہ مذہب قدم رکھتا ہے اور نہ مذہب کے حدود میں سائنس قدم رکھ سکتی ہے، ایک کا کام دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

مذہب سے الگ ہو کر صرف "سائنس" کے بھروسہ پہ جینے والوں کا انجام کیا ہوگا یا کیا ہو سکتا ہے، اب تو سب کے سامنے آچکا ہے، لیکن اس سے پہلے بھی چونکانے والوں نے دنیا کو چونکایا تھا، ڈاکٹر الفریڈ ایون نے اپنی مشہور تقریر میں ایک دفعہ جتلایا تھا جو سابق "جنگِ عظیم" کے ہولناک نتائج کے مشاہدہ کے بعد انھوں نے کی تھی۔

قوائے فطرت سے کام لے کر ہم نے انسان کے لیے نئی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں، لیکن خود انسان اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا، میں اپنی جوانی کے زمانہ میں خیال کرتا تھا کہ ایجادات اور سائنسی انکشافات کی بیز ترقیات، قوانین فطرت کی روز افزوں طلسم کشائیاں، علم و عمل کی کارفرمائیاں، انسان کی سرشت کو تبدیل کر کے رہیں گی، اور میرا خیال

Marfat.com

تھا کہ انجینئری کی تعلیم و اشاعت سے سخت دلوں میں نرمی آجائے گی، جذبات کی بہیمیت مدھم پڑ جائے گی، لیکن جنگ نے میری آنکھیں کھول دیں اور میں نے دیکھا کہ وہی علوم و فنون اور انجینئری کی ساری حکمتیں اور صناعیاں جن سے انسان کی خدمت کی جا سکتی تھی اُلٹی اُس کے حق میں دشمن بن گئیں اور اس کی وحشت و سنگ دلی، شقاوت و بہیمیت اور درندگی میں ان آلات سے بدرجہا اضافہ ہو گیا، اور تخریب و بربادی قتل و ہلاکت کی قوتوں کے عظیم الشان انجن ہم جانوروں کے ہاتھ آگئے۔"

اسی کی تعبیر لسان العصر مرحوم نے اپنے اس مشہور شعر میں فرمائی تھی:-

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا!

خون کے سمندر میں آج آدم کی اولاد جس بے کسی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مار رہی ہے کیا اس تماشے کے بعد بھی مرحوم اکبر کے قہقہہ کو صرف قہقہہ کہہ کر کوئی ٹال سکتا ہے۔ ھل یجزون الا ما کانوا یعملون۔

اور نتیجہ تو عملی نقطۂ نظر سے لادینی سائنس نے بنی آدم کے سامنے پیش کر دیا ہے رہا فکری و عملی نقطۂ نظر سے علم کی جدید نشات نے ہمیں کس مقام پہ لا کر کھڑا کر دیا ہے ایک شہادت اس سلسلہ کی بھی سُن لیجیے، ڈاکٹر ڈبلو ہیرنگ اپنے مقالہ "زمانہ اور اس کے اسرار" میں لکھتے ہیں۔

"طبیعاتی حکیم، اب بھی ناپ تول میں لگا ہوا ہے اور بڑے جوش و خروش تن دہی کے ساتھ، لیکن اب اُسے یہ نہیں معلوم ہو رہا ہے کہ آخر وہ کس چیز کو ناپ رہا ہے یا یہ کہ جسے اپنے خیال میں ناپ رہا ہے اُسے وہ واقعی ناپ رہا ہے اس کا

Marfat.com

فلسفیانہ سکون خاطر رخصت ہو چکا ہے اس کی طبعیات اور مابعد الطبعیات کی دھندلی فضائیں گم سی ہوتی جا رہی ہے۔ خاص کر مسئلہ اضافیت اور مسئلہ زمان پر اُس کے اثرات کے انکشاف کے بعد طبیعاتیوں کے ظنیات و مثنیات عالم کے مستقبل کی بابت اُس کی بربادی اس کی فنا اس کی احیاء ثانی سے متعلق (مادہ اور زمان کے مسائل کو شامل کرتے ہوئے) ہم پر سیلاب کی طرح اُبل پڑے ہیں اُن کا نام ریاضیاتی شاعری خوب پڑ گیا ہے۔" صدق یکم دسمبر ۱۹۴۵ء

بہر حال سائنس کی بحث بھی گزر چکی اور فلسفہ کے متعلق بھی آپ کو بہ تفصیل یہ معلوم ہو چکا کہ اس کے دو بڑے اور مشہور اسکول ثنویت اور تصوریت نہ صرف خدا کے قائل بلکہ اُس کے زبردست وکیل ہیں اور زیادہ تر فلسفیوں کا رجحان اُن ہی دونوں خیالات کی طرف ہے، اسی طرح ارتیابیت والے اگر موافق نہیں تو اُنھیں مذہب کی مخالفت سے بھی کوئی سروکار نہیں، البتہ فلسفیوں کی سب سے چھوٹی جماعت یعنی مادیت والے ضرور صحیح معنوں میں مذہب کے مخالف کہے جا سکتے ہیں، اب ذرا تفصیل کے ساتھ ہمیں اس پر نظر ڈالنی چاہیے کہ اس مخالفت کو بھی کس حد تک اہمیت دی جا سکتی ہے۔

مادیت اور مادہ بتایا جا چکا ہے کہ مادیت والے کہتے ہیں کہ ہر قسم کی صفات حیاتی ہوں یا غیر حیاتی دونوں کا سرچشمہ مادہ ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ مادہ جس پر کائنات کی ساری عمارت اُٹھائی گئی ہے خود کیا ہے آیا وہ کوئی چیز ہے بھی یا نہیں۔

علم اور وہم میں فرق بظاہر ہے کہ بغیر جانے ہوئے ہم کسی چیز کے ہونے نہ ہونے

Marfat.com

کا فیصلہ نہیں کرسکتے، جان کر کسی چیز کو ماننا یہ تو علم ہے اور بے جانے ہوئے کسی حقیقت کا اعتراف کرلینا اسی کا نام وہم ہے۔

انسان کے علمی ذرائع

اور کھلی ہوئی بات ہے کہ ہمارے علم اور جاننے کے ذرائع ہمارے حواس ہیں ایسا شخص جو ہر قسم کے حواس سے محروم ہو یقیناً وہ ہر قسم کے علم سے بھی محروم ہوگا زیادہ سے زیادہ اس کو کسی بات کا علم اگر ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ "میں ہوں"۔

خوب سوچیے اپنی ذات کے اس حضوری شعور کے سوا اور بھی کسی علم کو وہ اپنے اندر پاسکتا ہے؟

عقل کا حواس سے تعلق

یہ خیال کرنا کہ جن چیزوں کو ہم حواس سے نہیں دریافت کرسکتے ان کا علم عقل کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے ایک غیر فلسفیانہ خیال ہے۔

عقل حواس کے آگے آگے جاتی ہے یا پیچھے پیچھے چلتی ہے؟ اس پر غور کرنا چاہیے، فرض کیجیے کہ ایک شخص مادر زاد بہرا ہے کیا اس کی عقل آواز کے زیر و بم تال اور سُر کے متعلق کچھ بھی سوچ سکتی ہے، حالانکہ بہرے کے پاس عقل ہوتی ہے اور کامل عقل ہوتی ہے، لیکن قوتِ سامعہ جس کے ذریعہ سے آواز کا علم حاصل ہوتا ہے غریب بہرا اس سے محروم ہے اس لیے اس کی عقل بھی آواز کے متعلق کچھ نہیں سوچ سکتی۔

پس اصل یہ ہے کہ حواس جب کسی چیز کا علم ہم میں لاتے ہیں تو اس کے بعد عقل ان کی ترتیب و تقسیم کر سکتی ہے اس سے مناسب نتائج نکال سکتی ہے۔ لیکن جہاں سرے سے حواس کی رسائی ہی نہ ہو ظاہر ہے کہ عقل کی رسائی وہاں تک ناممکن

Marfat.com

ہے الشیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ "عقل حواس کے تابع ہے نہ کہ اس کی حکمران" ڈاکٹر اقبال مرحوم نے شیخ کے اسی خیال کا ترجمہ اپنے شعر میں اس طرح کیا ہے :

فروغِ دانشِ ما از قیاس است　　　قیاسِ ما زِ تقدیرِ حواس است

بہرحال یہ مسلّم ہے کہ ہم اپنا حقیقی معلوم اسی شئے کو کہہ سکتے ہیں جس کا احساس ہمارے حواس کر سکیں اور ظاہر ہے کہ ہمارے حواس میں سے ہر حاسّہ کا تعلق خاص خاص معلومات ہی تک محدود ہے، مثلاً قوتِ شامہ کا تعلق بو سے ہے۔ قوتِ سامعہ کا تعلق آواز سے ہے، قوتِ لامسہ کا تعلق سختی، نرمی، گرمی، سردی حرکت وغیرہ سے ہے، قوتِ باصرہ کا تعلق رنگ، روشنی، مقدار، شکل اور حرکت سے ہے علیٰ ہذا قوۃ ذائقہ کا تعلق تلخی و شیرینی وغیرہ سے ہے۔

مادّہ کا محسوس ہونا ناممکن ہے

اب اندازہ کرو کہ جن چیزوں کا احساس ہمارے حواس کو ہو رہا ہے یا جنہیں وہ محسوس کر رہے ہیں، وہ کیا ہیں؟ کیا رنگ مادّہ ہے، یا روشنی مادہ ہے، یا مقدار و شکل مادہ ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں تو صفات ہیں پھر وہ چیز جس پہ مادیت کی بنیاد قائم ہے۔ یعنی خود مادّہ اس کو اُن مادہ پرستوں نے کس راہ سے جانا؟ صرف یہی نہیں اب ذرا آگے غور کرو کہ خود یہ صفات کیا ہیں؟

کیا یہ محض ہمارے احساسات نہیں؟ اگر حواس نہ ہوں تو کیا پھر بھی ان صفات کے متعلق کوئی حکم کر سکتا ہے کہ وہ موجود ہیں، پس اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ صفات کا اثر ہمارے حواس پہ نہیں پڑتا بلکہ حواس ہی سے یہ اثرات پیدا ہو رہے ہیں تو

Marfat.com

اس کو کون غلط ثابت کر سکتا ہے، برکلے نے ببانگ دہل یورپ کے مادیین کو چیلنج دیا کہ اگر کوئی ہمارے اس دعوے کو غلط ثابت کر سکتا ہے تو وہ میدان میں آئے آج اس دعوے کو دو سو برس کے قریب گزر چکے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ مادیت کے کسی اسکول سے اس کا کوئی معقول جواب نہیں وصول ہوا صرف جرمن کے مشہور فاضل کانٹ نے لکھا:

کانٹ کا مذہب

"اس میں تو شک نہیں کہ ہم براہِ راست جو کچھ جانتے ہیں وہ صرف مظاہر یا ہمارے ذہن ہی کے تصورات (فنا منا) (PHENO MENON) ہیں۔ باقی ذات یعنی (نومنا) (N O M E N O N) یا اشیاء کا کما ہی علم تو انسانی عقل کے لیے اس کا حصول قطعاً محال ہے، اُن کو کوئی شخص نہ جان سکتا ہے نہ کسی نے جانا ہے مگر ساتھ ہی ہم ان کے خارجی اور واقعی وجود کے قبول کرنے پر بھی بے بس ہیں جو اگرچہ بالذات مجہول ہیں لیکن ہمارے معلومات حسی اور کیفیات ذہنی کی وہی علت ہیں یہ دعوے کہ ہمارے معلومات کا کوئی مثنیٰ یا شبیہ باہر نہیں ہوتا ہے غلط ہے، درد ہمارا احساس ہے اور وہ ہم میں ہے، کانٹے میں اس کا مثنیٰ یا شبیہ موجود نہیں ہے، وہ چیز جسے ہم کانٹے کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہی ہمارے درد کا سبب ہے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہمارے ذہنی محسوسات کا کوئی نہ کوئی بیرونی سبب ہم سے باہر ضرور موجود ہے جس کی تعبیر زیادہ سے زیادہ ہم ان الفاظ میں کر سکتے ہیں کہ وہ انجانی کوئی چیز ہے ٹھیک ہماری مثال اس پیدائشی اندھے کی سی ہے جو اپنی قوتِ لامسہ سے گرمی کو محسوس کر سکتا ہے جو آفتاب کا اثر یا (معلول) ہے لیکن یہ نہیں جان سکتا کہ اس کی علت یعنی خود (آفتاب) کی شکل و

Marfat.com

صورت کیا ہے۔"

کانٹ کی اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اثرات اور احساسات کا ہم سے باہر کوئی نمونہ یا تشبیہ یا مثنیٰ تو موجود نہیں لیکن کوئی چیز ایسی ضرور ہے جو ہم میں رنگ و بو آواز وغیرہ کے احساسات کو پیدا کرتی ہے۔

الغرض اس کے نزدیک مادہ کی حقیقت کل اتنی ہے کہ وہ ہمارے احساسات کی علت ہے باقی وہ کیا ہے زندہ ہے یا مردہ یا کچھ اور، اس سے وہ بالکل علیحدہ رہنا چاہتا ہے مکسلے اس کی تشریح ان لفظوں میں کرتا ہے:۔

"آخر کار ہم ہیبت ناک مادہ کی نسبت اس سے زیادہ کیا جانتے ہیں کہ وہ ہماری شعوری کیفیات کی ایک انجانی اور فرضی علت کا نام ہے۔"

وہی اپنے مقالہ ہیلزم اینڈ آئیڈیلزم میں لکھتا ہے:

"آج کل سائنس اس سے زیادہ کسی بات کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی کہ (میٹریلزم) مادیت کا انتساب اس کی طرف ہو اس لیے کہ بہر حال میٹریلزم کی وقعت ایک فلسفیانہ (ڈاگما) ادعا سے زیادہ نہیں۔"

کیا مادہ ہمارے احساسات کی علت ہے

بقول کانٹ اپنی شعوری کیفیات کی علت کو خارج میں ماننے پر کیا ہم واقعی بالکل بے بس ہیں؟ کانٹ کے خیال کی بنیاد اس پر ہے کہ ہمارے حواس میں کوئی شعوری کیفیت یا احساسی اثر اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ وہ دوسری چیز سے متاثر نہ ہو، مثلاً ٹھنڈک کا اثر منہ اور زبان کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ برف زبان پہ نہ رکھی جائے، اس لیے ضرور ہے کہ ہم اپنے مختلف

Marfat.com

احساسات کے لیے مختلف اسباب کو فرض کریں، مگر غور کرو کہ اس میں بھی ایک مغالطہ ہے بلاشک ٹھنڈک کا احساس بغیر برف کے نہیں ہو سکتا لیکن خود برف کیا ہے کانٹ اس کو بھول گیا جس کو ہم برف کہتے ہیں وہ در اصل ایک سفید سخت دبیز سی چیز ہے اور یہ سارے صفات قوۃ ذائقہ کے نہیں بلکہ قوۃ لامسہ اور باصرہ کے احساسات ہیں پس کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ایک حواس کے احساسات جب دوسرے حواس کا سبب بن جاتے ہیں تو اس وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح پچھلا احساس صرف احساس ہی ہے۔اسی طرح پہلا بھی ہمارے دوسرے حواس ہی کا اثر تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب ہمارا علم صرف ہمارے احساسات تک محدود ہے تو کانٹ کا یہ کہنا کہ ان احساسات کا سبب احساسات کے سوا ہے گویا یہ ماننا ہے کہ ہم احساس سے باہر بھی قدم رکھ سکتے ہیں اور اُن کو جان سکتے ہیں حالانکہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس دائرہ سے باہر پاؤں نکالنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔

بہرحال کانٹ نے بہت زور لگا کہ علت کی آڑ میں مادہ کو دم توڑتا ہوا چھوڑا تھا لیکن حقیقت نے ثابت کر دیا کہ یہ آڑ بھی بے کار ہے اور وہ چیز جس کو مادہ کے نام سے پکارا جاتا ہے اس کا وجود مادہ پرستوں کے دماغوں میں ہو تو ہو لیکن واقع میں اس کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں۔

کیا مادّہ محل اور موصوف ہے

اثباتِ مادّہ میں بعضوں کا یہ کہنا کہ صفات بغیر موصوف اور محل کے کس طرح پائے جا سکتے ہیں آخر سفیدی بغیر کپڑے کے کیسے متصور ہو سکتی ہے، یہ بھی صرف مغالطہ ہے، میں کہتا ہوں کہ صفات کے لیے موصوف کا ہونا کیا ضرور ہے نارنگی میں کچھ صفات

Marfat.com

ہیں مثلاً سرخی ، زردی ، رنگ ، شیرینی ، مزہ ، گول شکل وغیرہ اب اگر ان تمام صفات کو ایک ایک کر کے نارنگی سے ہم نکال لیں تو پھر اس کے اندر کیا چیز رہ جاتی ہے جس کا نام مادہ رکھا جائے گا ، علاوہ اس کے خود یہ صفات جب صرف ہمارے احساسات ہیں تو ذہن کے سوا اُن کے لیے کسی اور محل کے تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

کیا مادّہ حقیقت ہے؟ اسی طرح بعضوں کا خیال ہے کہ صفات تو بدلتے رہتے ہیں لیکن ہر شے کی ایک حقیقت ہوتی ہے جو تمام تغیرات میں بطور قدر مشترک کے قائم رہتی ہے اور وہی مادہ ہے۔ یہ بھی ایک سطحی مغالطہ ہے واقعات سے اس کو بھی سروکار نہیں یہی تو ہمارا مطالبہ ہے کہ صفات کے علیحدہ کر لینے کے بعد بتاؤ کہ کیا چیز رہ جاتی ہے جس کا نام تم نے مادّہ رکھا ہے جو چیز بتائی جاسکتی ہے وہ صفت ہو گی ، اور جو صفت نہیں ہے اس کو نہ بتانے والا جان سکتا ہے اور نہ وہ جان سکتا ہے جس کو بتایا جائے گا کیونکہ حواس کا علم صرف صفات تک محدود ہے اور حواس کے سوا ہمارے پاس صحیح علم کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

بہرحال مادّہ جس کی تعریف ارسطو کے نزدیک یہ تھی کہ وہ نہ ایک ہے نہ چند ، نہ واحد ہے نہ کثیر ، نہ ثقیل ہے نہ خفیف ، نہ حار ہے نہ بارد یعنی اس کوئی ایجابی (ثبوتی) صفت نہیں پائی جاتی گویا وہ "کچھ نہیں" (لاشئے) کے مترادف ہے ، یا جیسا کہ دیمقراطیس کہتا ہے کہ وہ سالمات اور چھوٹے ذرّات کا مجموعہ ہے ، یا جیسا کہ اب حال میں کہا جاتا ہے کہ وہ برقی پاروں سے مرکب ہے اور ایثر[1] کے سمندروں میں

---

[1] ایتھر

Marfat.com

تیرتا پھرتا ہے، یہ سب ایک ایسے خواب کی تعبیر ہے جسے کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ تفصیل سے بتا دیا گیا کہ علمی ذرائع سے ہم بجز احساسات کے کچھ جان ہی نہیں سکتے اور جو چیز ان احساسات کے سوا عقل کے زور سے ثابت کی جائے گی خواہ اس کی تعبیر کسی لفظ سے بھی کی جائے لفظ کے سوا اس کے پیچھے اور کچھ نہیں ہو سکتا بس وہ لفظ جس کے بل بوتے پر سطحیوں نے یہ غل مچا رکھا تھا کہ اجرام سماوی سے لے کر سمندروں کی تہہ تک جو کچھ ہے سب ازلی اور عدیم الفنا مادہ اور انرجی (قوت) کی نیرنگیوں کا تماشہ ہے، ارضی، سماوی، عضوی، غیر عضوی، ساری کائنات کا ایک ایک ذرہ اور تمام حوادث بلا استثناء مادہ ہی کے ناقابل تقسیم ذرات کے باہمی اجتماع کے تعامل سے پیدا ہوئے ہیں، آپ نے دیکھا کہ جس اینٹ پہ یہ ساری عمارت کھڑی کی تھی وہ مادہ تھا جس کو تحقیق نے ثابت کر دیا کہ بجز ایک خود تراشیدہ وہم کے اس کی اور کوئی وقعت نہیں ہے، اب مادیین کے پاس کیا رکھا ہے جس پہ وہ اپنے قدم جما سکتے ہیں:۔

یہ وہی گرہ پڑا کبوتر کا　　　　جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا

ہمارے مخدوم و محترم مولانا عبدالباری ندوی نے اپنے رسالہ "مذہب و عقلیات" میں اس موقعہ پہ غالب کے اس مشہور شعر کو خوب چسپاں کیا ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پرزے　　　　دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

بہر حال سائنس اور فلسفہ کے حدود کو متعین کرتے ہوئے یکایک ہم اس قطعی نتیجہ تک خود بخود پہنچ جاتے ہیں کہ یہ سوالات یعنی ہم اور ہمارے احساسات (عالم) کی ابتدا کیا ہے، خود ہمارا، ہماری قوم، ہماری جنس ہماری گزشتہ اور آئندہ نسلوں کا اور اس عالم کا انجام کیا ہے؟ یہاں ہم کیوں ہیں؟ ہماری فطری آرزو مثلاً بقائے دوام کی

Marfat.com

خواہش غیر محدود ہونے کی تمنا ، زندگی کی موجودہ کش مکش سے نجات پانے کی کوشش وغیرہ کا لحاظ کرتے ہوئے کس دستور العمل کی پابندی ہمیں کرنی چاہیے۔

ثابت ہوچکا ہے کہ ان مذہبی سوالات کو علم کے معمولی ذرائع (عقل و حواس کی رہنمائی میں ہم کسی طرح حل نہیں کر سکتے ، اور جو شخص بھی اُن کو عقل و حواس کے ذریعہ حل کرنا چاہے گا وہ یقیناً بغیر جانے ہوئے کسی چیز کو مان لے گا ۔ یعنی وہم کا شکار ہو جائے گا ۔

کیا یہ مذہبی سوالات فطرت انسانی سے نکل سکتے ہیں۔

اور جس طرح یہ ناممکن ہے اسی طرح یہ بھی قطعاً محال ہے کہ ان سوالات کو فطرتِ انسانی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جائے انسان جب تک حیوان نہیں بلکہ انسان ہے ، اس کی ذہنی وسعت اور دماغی بلندی باقی ہے وہ مجبور ہے کہ ان سوالات کو پیدا کرے ، اُن کے حل کی راہیں ڈھونڈھے ، فطرت کے اس زورہی کا اندازہ کر کے مذہبی سوالات کے متعلق ایک فرنچ فلسفی گسکین نے لکھا تھا

”مذہب ابدی چیز ہے کیونکہ مذہب جس سوال کا جواب ہے وہ کسی زمانہ میں ، کبھی ، کہیں معدوم نہیں ہو سکتا ۔“ (الکلام علامہ شبلی)

اسی خیال کا اظہار رینان نے ان الفاظ میں کیا ہے :۔

”یہ ممکن ہے کہ وہ اشیاء جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محبوب ہیں مٹ جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے یا اس کی قوت میں زوال آجائے ۔“

رینان کا خیال ہے کہ انسان کی دماغی قوت کے لیے یہ ناممکن ہے کہ گدھوں اور

Marfat.com

گھوڑ دن کی طرح وہ اپنے ماضی اور مستقبل کے متعلق سوچنا چھوڑ دے اُس کے اپنے الفاظ یہ ہیں :-

" مذہب ہمیشہ علانیہ اس کا ثبوت دے گا کہ وہ خیالات قطعًا غلط ہیں جس میں جا ہا جاتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اسی پست خاکی زندگی تک محدود ہو جائے ۔"

پروفیسر ــــــ نے ان سوالات کی جڑوں کو انسانی فطرت کی جن گہرائیوں میں پایا اس کا اندازہ کرتے ہوئے اس فیصلہ پر اپنے آپ کو مجبور پایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :-

" مذہب کو جب کبھی بھی ختم کرنے کی کوشش کی گئی اس نے بھڑنے سر سے نئے برگ و بار پیدا کر لیے ہیں اسی بنا پر مذہب ابدی چیز ہے جو کبھی زائل نہیں ہو سکتی ۔"

لیٹر نے اس کے بعد بالکل صحیح لکھا ہے کہ جب انسان کی ذہنی طاقت بجائے سمٹنے کے وسیع ہو رہی ہے تو یقینًا مذہبی سوالات کی تڑپ اور بے چینی بھی اسی نسبت سے بڑھتی چلی جائے گی ۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں :-

" مذہب کا سرچشمہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور گہرا کر رہے ہیں انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہے اور اسی سے وہ قوت پائے گی ۔"

(ماخوذ از الکلام علامہ شبلی نعمانی)

Marfat.com

مذہبی سوالات کے حل کی فطری راہ خلاصہ یہ ہے کہ مذہبی سوالات نہ فطرت انسانی سے نکل سکتے ہیں۔ نہ علم کے عام اور معمولی ذرائع یعنی عقل و حواس سے اُن کو ہم حل کر سکتے ہیں، فلسفہ اور مذہب میں یہی بنیادی فرق ہے کہ اوّل الذکر ان سوالات کو عقل و حواس کے زور سے حل کرنا چاہتا ہے، اور مذہب بجائے ان معمولی ذرائع کے ایک جدید ذریعہ کی ضرورت ظاہر کرتا ہے، اور ہم نے دیکھ لیا کہ مذہبی سوالات کے حل کے لیے ہم علم کے ایک نئے ذریعہ کے قطعاً محتاج ہیں، یہ ناممکن ہے کہ ہم میں پیاس ہو لیکن اس کے بجھانے کے لیے پانی کا سامان نہ کیا گیا ہو، مذہبی سوالات کی بے چینی جب جب انسانی فطرت میں پیدا کی گئی ہے تو ان کے حل کرنے اور جاننے کی بھی فطری راہ ہونی چاہیے اور وہ ہمیشہ سے ہے، علم کے اسی جدید ذریعہ کا نام مذہبی زبان میں وحی اور نبوت ہے جب سے دنیا قائم ہے انسانی فطرت نے مذہبی سوالات کے حل کے لیے ہمیشہ اسی راہ کو اختیار کیا، گو وقتاً فوقتاً مختلف قرون و ممالک میں فلسفیوں کا ایک گروہ بھی پیدا ہوتا رہا جس نے ان جوابات کے لیے حواس و عقل کی قوتوں کو استعمال کرنا چاہا، لیکن اکثریت نے اس کی طرف کبھی توجہ نہیں کی، اس کے مقابلہ میں تاریخ اُٹھا کر دیکھو جب کبھی وحی اور نبوت کی روشنی میں یہ سوالات لائے گئے، انسانی گھرانوں میں اُتھل پتھل مچ گئی، بنی آدم کی بستیوں میں تہلکہ برپا ہو گیا، اس طریقہ کے فطری اور طبعی ہونے کی اس سے زیادہ روشن شہادت اور کیا مل سکتی ہے۔ ہم تمام دنیا کے علوم و فنون کا جائزہ لینے کے بعد آج اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مذہبی سوالات کی گرہ کشائی علم کے عام اور معمولی ذرائع (عقل و حواس) کے ناخن سے ناممکن ہے لیکن فطرت کا زور دیکھو کہ اُن طویل بحثوں کے بغیر انسانی فطرت نے ہمیشہ یہی سمجھا اور اسی پر عمل کیا کہ:۔

Marfat.com

آزمودم عقلِ دُور اندیش را | بعد ازاں دیوانہ کردم خویش را

فلسفیوں نے فطری صلاحیت کو بگاڑ کر قدرتی قوانین کے توڑنے کی کوشش کی، انھوں نے چاہا کہ نبوت اور وحی کے توسط کے بغیر ان سوالات کے جوابات حاصل کر کے بنی آدم کو مطمئن کر دیا جائے لیکن تحقیق نے ثابت کر دیا کہ بجز خود تراشیدہ اوہام اور فرضی وسوسوں کے ان کے جیب و دامن میں نہ کچھ تھا نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے انہوں نے اب تک جو کچھ بھی کہا ہے یا اس وقت کہہ رہے ہیں یا آئندہ کہیں گے بغیر جانے ہوئے کہیں گے۔ اور اسی کا نام وہم ہے، وہ واقعات نہیں ہوں گے بلکہ دماغی انجرات اور ذہنی وساوس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں ہو گی، مذہب نے ان ہی چیزوں کا نام اوہام رکھا ہے جس سے پرہیز کرنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ شیراز کے عارف نے اپنے مشہور شعر میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو | کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

وحی سے منقطع ہو کر جو خدا کو مانتا ہے وہ بھی وہم پرست ہے

یہ خیال کرنا چاہیے کہ جن فلسفیوں نے انبیاء کے لائے ہوئے جوابات کے خلاف رائے قائم کی ہے وہی وہم پرست ہیں بلکہ مذہبی سوالات کے حل کی فطری راہ وحی و نبوت سے قطع تعلق کر لینے کے بعد اگر اتفاقاً اُن میں سے کسی نے ایسا جواب پیش کیا ہو جو پیغمبروں کی تعلیم کے موافق ہو وہ بھی اگر غور کیا جائے تو ایک معمولی وہم پرست کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا مثلاً فرض کیجیے کہ عالم کے نقطۂ آغاز کے متعلق جس نے یہ رائے پیش کی کہ مظاہر کائنات اور محسوسات کے پیچھے صرف مادہ ہی مادہ کا وجود ہے، معلوم ہو چکا کہ ایسا شخص

Marfat.com

ایک ایسی چیز کا مدعی ہے جسے نہ حواس نے محسوس کیا ہے نہ اُس کی عقل وہاں تک پہنچ سکتی ہے، اس لیے اس کا وہم پرست ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن جو شخص صرف عقل و حواس کے بھروسہ پہ وحی و نبوت سے بے تعلق ہو کر یہ کہتا ہے کہ عالم کی ابتدا، خدائے زندہ سے ہوئی تو کیا اس کی وہم پرستی میں کچھ شبہ ہے؟ کیا یہ بھی از روئے عقل وہم پرست نہیں بلاشبہ یہ ایک ایسی حقیقت کے جاننے کا دعویٰ کر رہا ہے جس کے علم کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے ٹھیک اس کی مثال اس اندھے کی سی ہے جس کے سامنے چند رنگین کپڑے پیش کیے گئے اور پوچھا گیا کہ بتاؤ کس کپڑے کا کیا رنگ ہے اندھے نے بجائے آنکھ کے ہاتھ سے ٹٹول کر اس کا جواب دینا چاہا اتفاقاً جو کپڑا زرد تھا اس کے متعلق اُس نے یہ کہہ دیا کہ وہ زرد ہے لیکن اسی کے ساتھ اندھے کا یہ علم اور اس کی رائے بھی وہم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ وہ ایک ایسی چیز کے جاننے کا مدعی ہے جس کے جاننے کا صحیح ذریعہ (قوتِ بینائی) اس کے پاس موجود نہیں ہے، اسی طرح انبیاء سے بغاوت کرنے کے بعد جو عالم کو خدائے حیّ و قیوم کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار دینا چاہتے ہیں، غور کرنا چاہیے کہ ان کے اس فیصلہ کی بنیاد کیا ہے؟

"عالم خدائے زندہ و توانا کی مخلوق ہے" بجائے خود یہ ایک واقعہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وحی و نبوت کے واسطہ کو چھوڑ کر جو اس واقعہ کے جاننے کا مدعی ہے کیا وہ ایک ایسی چیز کے جاننے کا مدعی نہیں ہے جس کے جاننے کا عقلی طور پر اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں آخر اس اندھے کو تم کیا کہو گے جس نے آفتاب کو نہ تو خود دیکھا ہے اور نہ دیکھنے والوں سے اس کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن اعلان کرتا پھرتا ہے کہ میں بھی آفتاب کو جانتا ہوں، یہ سچ ہے کہ آفتاب کا وجود یقینی ہے لیکن بایں ہمہ آفتاب کے علم کا

Marfat.com

ہوئے اس اندھے کا علم نہیں بلکہ صرف وہم[1] ہے یہی حال ان لوگوں کا ہے جو پیغمبروں کی اطاعت
سے گھبراتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خدا کو بھی مانتے ہیں، اور اپنی طرف سے اپنی
زندگی پر کچھ قوانین عائد کر کے باور کیے بیٹھے ہیں کہ یہی خدا کی مرضی بھی ہے حالانکہ آپ
نے دیکھ لیا کہ وہ خدا کے نہیں بلکہ خود اپنے دماغ کی تراشی ہوئی باتوں کے تابع ہیں،
وہ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ یعنی خدا نے جو بات ان سے نہیں کہی ہے اس کو وہ خدا کی
مرضی، خدا کی بات قرار دینے کی جسارت کر رہے ہیں۔ چونکہ خدا کی مرضی سے مطلع ہونے
کی جو فطری راہ ہے اس سے انھوں نے بغاوت کی ہے، اس کی سزا یہ ہے کہ اپنے خود تراشیدہ
وساوس و اوہام کو خدا کی بابت، خدا کی مرضی ٹھہرا رہے ہیں، اس مسئلہ کی تفصیل کتاب کے

---

[1] جو چیزیں حواس کی گرفت میں نہیں آسکتیں، عقل کی رسائی بھی ان چیزوں تک نہیں ہو سکتی دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ جو محسوس نہیں ہیں وہ معقول بھی نہیں ہو سکتیں بظاہر یہ مسئلہ شاید بہتوں پر گراں گزرے لیکن تحقیق کا اقتضا بھی یہی ہے اور حکماء اسلام میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی مولانا روم جیسے اکابر اسی نظریہ کے شارح ہیں شیخ اکبر کی سوانح عمری میری زیر ترتیب ہے انشاءاللہ نظریہ علم کے باب میں اس پر مفصل بحث کی جائے گی ایک مختصر سا مضمون اورینٹل کانفرنس میں خاکسار نے اس موضوع پر پڑھا بھی تھا۔ معارف اعظم گڑھ دارالمصنفین میں یہ مضمون شائع ہو چکا ہے۔
شیخ اکبر کا اس نظریہ کی بنیاد پر مشہور قول ہے فمن طلب اللّٰہ بعقلہ من طریق فکرہٖ ونظرہٖ فھو تائہ (فتوحات) یعنی جو خدا کو فکر و نظر کی راہ سے محض عقلی طریق سے طلب کرتا ہے، یہ تائہ یعنی سراسیمہ و گمراہ آدمی ہے ۱۲ منہ۔

Marfat.com

آخری باب میں آپ کو زیادہ بسط و وضاحت کے ساتھ انشاء اللہ ملے گی۔

مذہب اور فلسفہ میں فرق

بہرحال محسوسات کے پیچھے کیا تھا؟ اور کیا ہے؟ یا کیا ہوگا؟ یہ اور اسی قسم کے تمام مذہبی سوالات فطری ہیں، اور ان سوالات کو علم کے کسی جدید ذریعہ کے بغیر حاصل کرنا قدرتی قوانین کے توڑنے کی کوشش ہے۔ پس مذہب وہی ہے جس میں ان سوالات کو علم کے جدید ذریعہ (کشف و الہام وحی و نبوت) سے حل کیا گیا ہو۔ بلکہ مذہب مذہب بن ہی نہیں سکتا۔ جب تک کہ اس کے معلومات کی بنیاد بجائے عقل و حواس کے الہام و وحی اور خدا کے غیر محدود علم پر نہ رکھی جائے اگر دنیا میں کوئی ایسا مذہب ہے تو وہ مذہب نہیں فلسفہ ہے، وہم ہے، وسوسہ ہے۔

رہ گیا یہ سوال کہ اس جدید حاسہ کی کیا نوعیت ہے اور اس کے ذریعہ سے غیبی معلومات کیونکر حاصل کیے جاتے ہیں، یہ الگ مسئلہ ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ دنیا کی قوموں اور امتوں میں شاید ہی کوئی قوم یا کوئی اُمت ایسی پائی جاتی ہو جو علم کی اس نئی راہ کی قائل نہ ہو، اسی لیے ہمیں جو کچھ بھی اس باب میں کہنا ہے اُن ہی چند انتشائی افراد کے لیے کہنا ہے جو سرے سے کسی نبی یا صاحب وحی کے تحت زندگی گزارنے سے منکر ہوں (شاید اس مسئلہ پر مجھے ایک مستقل کتاب بھی لکھنی پڑے)

یہاں تو مختصراً صرف اتنا اس سلسلہ میں عرض کرنا ہے کہ انسانوں کے بعض افراد میں ایک جدید قوت پیدا ہوتی ہے، اور اس قوت کے ذریعہ سے ان کی رسائی کائنات کے ابتدائی سرچشمہ تک ہوجاتی ہے۔ جس کے بعد وہ ان تمام امور کو کما حقہ، جان لینے

Marfat.com

ہیں جن کو ہم براہ راست نہیں جان سکتے۔ ان لوگوں کی آنکھ بھی خدا ہوتا ہے، اور کان بھی خدا ہوتا ہے [1] یعنی وہ خدا ہی سے جانتے ہیں، خدا ہی سے سنتے ہیں [2] ہم عوام الناس کی حالت اُن کے سامنے اس اندھے کی سی ہوتی ہے جو آفتاب کو خود نہیں دیکھ سکتا

---

[1] اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا ہی اُنھیں وہ دکھاتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے اور وہ سناتا ہے جو دوسرے نہیں سن سکتے ۱۲ - م

[2] ہم اپنے خیالات دوسروں تک کس طرح منتقل کرتے ہیں۔ اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے وجود کا وہ غیر محسوس حصہ یا شعوری نقطہ جس پر ہماری خودی اور انانیت کی بنیاد قائم ہے اسی سے خیالات کی موجیں اٹھتی ہیں جو پہلے دماغ کو متاثر کرتی ہیں دماغ زبان کو حرکت میں لاتا ہے اور یوں زبان ہمارے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچاتی ہے، گفتگو اور بیان کا یہ کاروبار دن رات جاری ہے ہر شخص کو اس کا ذاتی تجربہ ہے لیکن یہ سوال کہ دماغ تک خیالات کس طرح پہنچتے ہیں اور دماغ سے زبان تک وہ کیسے پہنچتے ہیں ظاہر ہے کہ اس کا جواب آسان نہیں ہے پھر اگر اس عالم کبیر کا وجود جو انا مطلق ہے اگر جبرئیلی حقیقت کو متاثر کرتا ہے اور جبرئیلی حقیقت "الرسول" (جو گویا خدا کی زبان ہے) کو متاثر کرتی ہے تو اس میں لوگوں کو حیرت کیوں ہوتی ہے۔

Marfat.com

لیکن کسی دیکھنے والے کے ذریعہ سے سُن کر ماننا ہے۔ اس جدید حاسہ والے کامل ترین نفوس کے کامل ترین افراد کا نام مذہبی زبان میں نبی، رسول اور پیغمبر ہے۔ پیغمبران سوالات کے جوابات کو براہِ راست جانتے ہیں اور ہم ان سے سُن کر ایمان لاتے ہیں۔

ماننا اور جاننا دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی حقائق اور غیبی امور جن کے جاننے کے لیے انسانی فطرت بے چین ہے اور رہے گی، ان کے براہِ راست جاننے کی تو عام انسانوں میں صلاحیت نہیں ہے لیکن ماننے کی صلاحیت ہر فطرت میں ہونی چاہیے[1] کیونکہ ایسا مذہب جو ہم پر ایسے معلومات پیش کرتا ہو۔ جس کے ماننے کی بھی فطرت انسانی میں گنجائش نہ ہو تو وہ جنوں یا فرشتوں کا مذہب تو ہو سکتا ہے لیکن انسانوں کا مذہب نہیں ہو سکتا قرآن مجید نے مذہب .... حق کے اس معیار کا ذکر اپنے مشہور اصول " لا یکلف اللہ نفسًا الا وُسْعَھَا " میں کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو بھی اس کی فطری گنجائش سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی ہے۔ ایمان ہو یا عمل، ہم میں جس چیز کی صلاحیت پیدا کر دی گئی ہے اسی کا ہم سے

---

[1] شیخ اکبر نے اس کا اظہار کرنے کے بعد کہ عقل سے حق تعالیٰ کا علم حاصل کرنے والا تھہ اور گمراہ ہے۔ ارقام فرمایا ہے کہ عقل کا کام نہیں بلکہ انما حسبہ التھیؤ والقبول ما یُھَبُہُ اللہ من ذالک فافہم۔ یعنی عقل کا کام صرف یہ ہے کہ وہ خدا کے عطا کیے ہوئے معلومات کو قبول کرے ۱۲۔

Marfat.com

مطالبہ کیا جاتا ہے۔

سچے اور جھوٹے مذاہب میں امتیاز کا معیار

پس مذہب فلسفہ سے تو اس لیے علیحدہ ہو جاتا ہے کہ اوّل الذکر کی بنیاد کشف و وحی پر ہے اور ثانی الذکر کی بنیاد عقل و حواس پر قائم ہے۔ اسی طرح سچے مذاہب کو جھوٹے مذاہب سے جدا کرنے کا عام اور سادہ معیار یہ ہے کہ اسے انسانی فطرت پر پیش کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس مذہب کی تعلیمات کو ماننے کے لیے فطرت کس حد تک تیار ہے؟ اگر عقل و فطرت میں اس کے ماننے کی گنجائش ہے تو یہی مذہب "دین الفطرۃ" ہے اور جس مذہب کے معلومات اور نظریات کو ہماری فطرت نہیں قبول کرتی تو اس مذہب کے بطلان کی یہی دلیل ہے۔

لاروس (فرانسیسی) نے مذہب کے متعلق یہ لکھا تھا کہ

"مذہب آتا ہے اور کہتا ہے کہ گردن ڈال دو، کس کے آگے؟ کیا عقل کے آگے؟ نہیں؟ نہیں فطری فرائض کے آگے؟ نہیں، احساسات اندرونی کے آگے؟ نہیں۔"

کاش اُسے معلوم ہوتا کہ دنیا کا جو فطری مذہب ہے وہ ان تمام سوالات کے جواب میں بجائے "نہیں" کے "ہاں" کا اعلان کرتا ہے اور اسی کو اپنی صداقت کی دلیل قرار دیتا ہے اُس نے اپنا نام ہی "دین فطرت" رکھا ہے اور وہ ہمیشہ تعلیمات کو پیش کرنے کے بعد عقل انسانی کو جگاتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ تمہاری عقل جس حد تک گہری اور بیدار ہوتی جائے گی مذہبی امور کے ماننے کی بھی صلاحیت تم میں بڑھتی جائے گی۔ جیسا کہ میں نے کہا اُس نے اپنا نام ہی دین فطرۃ قرار دیا ہے اور اپنا فرض ہی یہ

Marfat.com

ٹھہرایا ہے کہ جو لوگ اپنی فطرت کے نقطہ سے ہٹ کر غیر فطری زندگی بسر کر رہے ہیں یا غیر فطری احساسات اور معلومات میں اُلجھ کر پریشان ہو رہے ہیں اُن کو فطری نقطہ تک لایا جائے یہی اس کا حقیقی کام ہے۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ
ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمون ؎

(یعنی یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر آدمی کو خدا نے پیدا کیا ہے۔ دینی دعوت سے فطرت کا بدلنا مقصود نہیں ہے یا اللہ کی پیدا کی ہوئی خلقت کو تبدیل کرنا نہیں ہے یہی سیدھی، لازوال، محکم اور استوار راہ ہے۔ لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔"

بہرحال مذہب حق کی صداقت کا ایک بڑا نشان یہی ہے کہ اُس کی تعلیمات کے ماننے کی انسانی فطرت میں گنجائش تلاش کرنی چاہیے نہ کہ جاننے کی، اسی لیے پیغمبروں نے ہمیشہ ایمان (یعنی ماننے) کا مطالبہ لوگوں سے کیا، مغالطہ یہ ہوا کہ پیغمبروں نے ہم سے جن چیزوں کے ماننے کا مطالبہ کیا تھا، نادانوں نے سمجھا کہ وہ ہم سے براہِ راست ان کے جاننے اور محسوس کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں، پیغمبر کہتے ہیں کہ ان چیزوں کو مانو لیکن احمقوں نے کہا کہ ہم ان چیزوں کو نہیں جانتے ہیں، ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ ہم کسی سے پھول سونگھنے کا مطالبہ کریں تو اس کے جواب میں کہے کہ ہم پھول کی خوشبو کو کان سے سُن نہیں سکتے ہیں۔ اس زمانہ میں مذہب کے غیبی حقائق الملائکہ الجنت النار البقر، والبرزخ وغیرہ وغیرہ کے متعلق جو مباحث چھڑے ہوئے ہیں، بادنیٰ تامل واضح ہو سکتا ہے کہ جاننے اور ماننے کے عدم امتیاز ہی پر اس کی بنیاد زیادہ تر قائم ہے پیغمبر کہتے ہیں ان امور کو مانو اور انکار کرنے والے

Marfat.com

کہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کو جان نہیں رہے ہیں ۔

علم الکلام

مجھے دنیا کے دوسرے مذاہب سے اس وقت بحث نہیں ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے ذریعہ سے جو معلومات انسانی بستیوں میں تقسیم فرمائے ہیں اور جو چیزیں ہم تک پہنچائی ہیں اُس کا ایک ایک جز ایک ایک مسئلہ صداقت کے اس معیار پہ کھڑا ہو کر اُترتا ہے اُتر سکتا ہے اُتر چکا ہے) علماء اسلام نے اس کے لیے ایک خاص علم بنایا ہے ۔ جس کا نام " علم الکلام " ہے اس فن میں یہی کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے اصولی مسائل میں سے ایک ایک مسئلہ کو لے کر دیکھا جاتا ہے کہ اس کے ماننے کے لیے انسانی عقل ، ہمارے فطری ذائقے ، اندرونی احساسات اور اصولِ فطرت کس حد تک ہم آہنگ ہیں اور ہم اپنے اس درس میں اسلامی حقائق پہ اسی حیثیت سے انشاء اللہ بحث کریں گے ۔

ایمان و معرفت یا ماننا اور پہچاننا

لیکن کیا مذہبی تحقیقات کا دائرہ اسی حد تک ختم ہو جاتا ہے ؟ یہ سچ ہے کہ علماء ظاہر کی کوششوں کا یہ آخری نقطہ پہ وازہے وہ ثابت کر دیتے ہیں کہ

(۱) مذہب کے سوا عقائد و نظریات ان سوالوں پہ مبنی ہیں جو انسانی فطرت سے بے اختیار اُبلتے رہتے ہیں اور اُن کے اُبلنے کو کوئی روک نہیں سکتا ۔

(۲) وہ یہ بھی ثابت کر دیتے ہیں کہ ان سوالات کے جوابات علم کے عام ذرائع یعنی حواس و عقل سے دینا " ممکن ہے اور ان کے حل کے لیے ہر حال میں ہمیں ایک جدید علمی ذریعہ کی جس کا نام مذہب کی اصلاح میں " وحی " ہے ، احتیاج ہے ،

Marfat.com

اور یہ ساری باتیں گزشتہ بالا مباحث میں بہ تفصیل سمجھائی گئی ہیں۔

(۳) اس کے بعد یہ علماء یہ بھی دکھا دیتے ہیں جیسا کہ انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ معلوم ہوگا کہ وحی اور نبوت کے علمی ذریعہ سے جو جواب ہم تک پہنچا ہے عقل و فطرت اور دیگر فطری احساسات کے وہ بالکل مطابق ہے۔ ان سوالات کو براہِ راست جاننے کا تو کوئی ذریعہ ہم میں نہیں ہے لیکن ماننے اور قبول کرنے کے لیے فطرت انسانی بالکل تیار ہے اور بلاشبہ کسی مذہب کے متعلق اطمینان و تشفی حاصل کرنے کے لیے حکیمانہ روش یہی ہو سکتی تھی۔

لیکن مسلمانوں میں ایک اور گروہ ہے جس کا دعویٰ ہے کہ صرف ماننے پر قناعت نہیں کرنا چاہیئے ان کو نبوت و وحی کے معلومات کا مشاہدہ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عام حواس اور عقل کے سوا ہر انسان میں کچھ اور علمی قوتیں بھی پوشیدہ ہیں جن کی طرف مرزا بیدل نے اپنی مشہور غزل کے مطلع میں بایں الفاظ اشارہ کیا ہے:-

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

قرآن نے اسی سرِ انسانی کی تعبیر "نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي" سے کی ہے۔

بہر حال یہ اندرونی قوتیں انبیاء علیہم السلام کے کامل اتباع اور پیروی کے بعد رفتہ رفتہ بیدار ہوتی ہیں، اور جس کی یہ مخفی قوتیں کھل جاتی ہیں وہ ان چیزوں کو دیکھ کر پہچانتا ہے جن کو وہ اب تک صرف مان رہا تھا، بالفاظ دیگر جس شخص کی یہ باطنی قوتیں جاگ اٹھتی ہیں تو اس کو مذہبی حقائق کی معرفت و شناخت شروع ہو جاتی ہے۔ ان

Marfat.com

کے اسی علم کا نام "معرفت" یعنی 'شناختن' ہے کیونکہ پیغمبروں نے جن چیزوں کو جانا تھا ان ہی کو وہ پہچانتا ہے، اور شناخت ہو یا پہچان اس کا تعلق اُن ہی امور سے ہو سکتا ہے جن کے ساتھ گونہ علم بالواسطہ یا بلاواسطہ پہلے متعلق ہو چکا ہو، معرفت و شناخت کے اس مقام پہ جب عارف پہنچتا ہے تو چلّا اُٹھتا ہے :-

صد کتاب و صد ورق در نار کن — جانِ خود را جانبِ دلدار کن
صیقلے کن یک دو روزے سینہ را — دفتری خود سازہ آں آئینہ را
آئینہ دل چوں کسی صاف و پاک — نقش ہا بینی بروں از آب و خاک
ہم بہ بینی نقش و ہم نقاش را — فرش دولت را و ہم فراش را
اندر آں اشکال عینی رو دہد — عکس حوری و ملک در دے جہد

(رومی)

خلاصہ یہ ہے کہ :-

پنبۂ وسواس بیروں کن ز گوش — تا بگوشت آید آوازِ سروش
بینی اندر دل علومِ انبیاء — بے کتاب و بی معید و اوستا

(رومی)

قرآنِ کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کی اس مخفی قوت کے ظہور کا وعدہ فرمایا ہے، اور کوشش کرنے والے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

فاتقوا اللہ یعلمکم اللہ (خدا سے ڈر کر بچو، اللہ تمہیں سکھانے اور بتانے لگے گا)

Marfat.com

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (اور جو ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں انھیں ہم اپنی راہ دکھاتے ہیں۔)

لیکن اس "معرفت" اور "شناختن" کے لیے طالب کو بجائے مدرسہ اور کسی کالج کے کسی خانقاہ میں اور بجائے "گفت و قال" کے "رفت و حال" والوں کے پاس جانا چاہیے، ہمارے سامنے تو اس وقت صرف متکلمین اسلام کی روش ہے اور اصول اسلام کے اثبات کا یہی وہ طریقہ ہے جسے "علم الکلام" کہتے ہیں۔

کلام کے معنی اور اُس کا فائدہ

اس میں بہت کچھ اختلاف ہے کہ کلام کے کیا معنی ہیں، لیکن اگر تاریخی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر صرف لغت کی طرف رجوع کیا جائے تو اس لفظ کی تعیین بآسانی ہوسکتی ہے، بات یہ ہے کہ مذہب حق کو باطل سے ممتاز کرنے کا ایک طریقہ تو "معرفت" اور "شناختن" کا ہے جو "عمل" اور "مجاہدہ" پہ موقوف ہے اور یہ ہر شخص کو میسّر نہیں، دوسرا وہی معمولی طریقہ ہے کہ فطرت انسانی کے ساتھ اس مذہب کی تعلیمات کی وابستگی دکھائی جائے۔ یعنی انسان کی فطری اور قدرتی گنجائشوں سے اپیل کی جائے۔ اس میں بھی دو راہیں ہیں بعض لوگ باتوں کے ذریعہ سے اس کوشش میں کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان ہی لوگوں کے طریقہ کو "کلام" یعنی بات کرنے کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ اور بعضوں نے کلام کی اس راہ کو دراز و دُور کی راہ پایا کیونکہ ظاہر ہے کہ اس میں ایک ایک مسئلہ کو لینا پڑتا ہے اور فطرت انسانی پہ پیش کرکے اس کی وسعت اور گنجائش بتائی جاتی ہے اور پھر اُس میں ردّ و قدح ہوتی ہے اور یہ سلسلہ دُور تک چلتا ہے اور بسا اوقات اس میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے

Marfat.com

کہ جو زبان آور ہوتا ہے وہی بازی لے جاتا ہے۔

پھر قطع نظر دُور دراز ہونے کے یوں کبھی یہ راہ خطروں سے بھری ہوئی ہے۔ ان ہی وجوہ سے محققین اسلام نے اس کلامی راہ کو چھوڑ کر ایک اور مختصر راہ نکالی ہے۔

پیغمبرانہ سیرت کے نمونوں کی راہ

ان بزرگوں نے اندازہ کیا کہ انسانی فطرت جن اعلیٰ اخلاق اور جس اعلیٰ دانش کے آگے جھکتی ہے جسے پیغمبروں کی سیرت کہتے ہیں، حتی الوسع اسی کو اپنے اندر پیدا کر لیا جائے۔ جب انسان کسی شخصیت پر اعتماد کر لیتا ہے تو پھر جو کچھ اُسے کہا جاتا ہے بغیر دلیل کے مانتا چلا جاتا ہے، ارباب علم و اخلاص کے ایک بڑے گروہ نے دین کی دعوت کا یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی مسائل اور دینی دعوت کے لیے جتنی کارگر راہ یہ ہے شاید کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ سچ کے آگے ممکن ہے کہ انسان نہ جُھکے لیکن سچے کے نیچے دب جانے پر وہ مجبور ہے۔

پس واقعہ تو وہی ہے کہ مذہب اور مذہبی حقائق کے متعلق خود مطمئن ہونے یا دوسروں کو مطمئن کرنے کی طبعی راہ وہی ہے جس پر ہم "اللہ والوں" کو پاتے ہیں۔

علم کلام کا فائدہ

لیکن اسی کے ساتھ جن لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ مذہب کی بنا صرف روایت پرستی یا خوش اعتقادی پر قائم ہے "علم کلام" سے اس غلطی کا ازالہ قطعی طور پر ہو جاتا ہے، اس علم کے مطالعہ کے بعد ہر مسلمان اپنے کو خاندانی روایات کا شکار یا خوش اعتقادی کا اسیر

Marfat.com

نہیں بلکہ عقل و دانش کی روشن راہ پر پاتا ہے۔ بوالہوسوں کا یہ غوغا کہ مذہبی ہونا یا دین دار ہونا احمق و بے وقوف ہونے کے ہم معنی ہے "علم الکلام" سے اس کی تردید پوری قوت کے ساتھ ہو جاتی ہے، بلکہ اُس کے برعکس یہ غیر مشتبہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ بے ایمانی بداطواری کی زندگی صرف انہی لوگوں کی ہو سکتی ہے جنہوں نے اپنی عقل و بصیرت پہ ظلم کیا ہے اور فسق و فجور کے ہتھوڑوں سے اپنے فطری احساسات کو کچل چکے ہیں۔

مذہب کی مخالفت میں جو کچھ کہا جاتا ہے "علم کلام" کا طالب علم اپنے اندر یہ زور محسوس کرتا ہے کہ مذہب کی تائید و حمایت میں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر باتیں کی جا سکتی ہیں اور یقیناً اس علم کا یہ بڑا فائدہ ہے۔ اب میں اسی کلامی طریقہ پر حسب وعدہ ان اجزاء پر بحث کرتا ہوں۔

Marfat.com

وجودِ باری

عالم کی ابتداء کیا ہے ؟ ——— فطرت انسانی کے اس اہم اور لازوال مطالبہ کے جواب میں تاریخ کے غیر معلوم زمانہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنی رائے یا قیاس سے نہیں بلکہ واضح تجربات اور بیّن مشاہدات کی بنیاد پر جو جواب دنیا کی ہر قوم اور خطہ میں پیش کیا ہے اور جس کی توثیق اس وقت بھی "معرفت" اور "شناخت" کے میناروں پر چڑھنے والے نفوس کر رہے ہیں اسی جواب کی تعبیر "مسئلہ وجود باری" سے کی جاتی ہے ہم سب سے پہلے کلامی معیار پر جانچنے کے لیے اسی مسئلہ کو لیتے ہیں، ان کا دعوےٰ ہے کہ عالم کی ابتدا بے جان و بے ارادہ مادّہ سے نہیں بلکہ حیّ و قیوّم علیم و خبیر زندہ و توانا خدائے قیوم سے ہوئی ہے اس مجمل دعوے کی اگر تحلیل کرو گے تو اس کے متعلق ان چند سوالات کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔

(۱) خدا کی ذات کیا ہے ؟

(۲) خدا کے صفات کیا ہیں ؟

(۳) خدا سے یہ عالم کس طرح ظاہر ہوا ؟

Marfat.com

(۴) خدا نے عالم کو کیوں پیدا کیا؟[1]

اب ان میں سے ہر سوال کے جواب میں انبیاء علیہم السلام خصوصًا نبی الانبیاء خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جو ذاتی تجربات و مشاہدات پیش کیے ہیں، اُن کو عقل و فطرت پہ پیش کرو اور دیکھو کہ جبلّتِ بشری اُن کے ماننے پہ کس طرح مجبور اور بے لبس ہے۔

خدا کی ذات

ابھی صفات سے بحث نہیں ذات سے بحث ہے خدا کی ذات کو لو اور دیکھو کہ پیغمبروں نے جو کچھ دیکھا اور جانا ہے کیا ہم اس کے سوا کچھ اور بھی مان سکتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ پیغمبروں کا، خدا کی ذات کے متعلق جو تجربہ ہے وہ یہی ہے کہ وہ ایک ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے، لیکن وہ کسی سے پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ خود بخود ہمیشہ سے ہے، اس تجربہ میں خصوصًا دو چیزیں حل طلب ہیں۔

(۱) کیا ہم کسی ایسی ہستی کو سوچ سکتے ہیں جو خود بخود موجود ہو؟

---

[1] اسلام کا عملی نظام جو شخصی، خاندانی، قومی اور عام انسانی تعلقات، نیز خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے تعلقات کی تفصیل کا نام ہے، اور اصل عمل کا یہی نظام اس سوال کا جواب ہے، دیباچہ میں اشارہ کرچکا ہوں کہ اس کی تفصیل بھی قلم بند ہو چکی تھی لیکن تحریر کا رنگ چونکہ اس میں بدل گیا اس لیے ایک مستقل حصہ قرار دے کر "الدین القیم" حصہ دوم اس کا نام رکھ دیا ہے جو انشاء اللہ بعد کو شائع ہوگا۔ ناظرین کو اس سوال کا جواب اسی حصہ میں انشاء اللہ ملے گا۔ ۱۲ منہ

Marfat.com

(۲) کیا ایسی چیز کا قدیم و ازلی ہمیشہ ہمیشہ ہونا ضروری ہے؟ یعنی اس پہ نیستی کا طاری ہونا ناممکن ہے، یا یوں کہو کہ اس کے لیے کوئی ایسا وقت یا زمانہ فرض نہیں کیا جا سکتا جب وہ نہ ہو؟

بلا شبہ نظام ہستی میں اس حقیقت و واقعہ کا براہ راست علم و تجربہ تو انہی کو ہو سکتا ہے جو علم کے غیر معمولی ذرائع وحی، نبوت، کشف و الہام سے موصوف ہیں۔

لیکن ہماری عقل و فطرت اور ہمارے اندرونی احساسات کے لیے بھی اس حقیقت کی گرفت ایسی سخت ہے کہ ہم نہ صرف اس کے ماننے پہ مجبور و مضطر ہیں بلکہ آپ دیکھیں گے کہ اس حقیقت کا ہر انکار ہمارے دماغ کی فطری ساخت کے لیے اقرار بن جاتا ہے، آپ کو نظر آئے گا کہ ہمیں پیغمبروں نے وہی پانی دیا ہے جس کے لیے ہماری فطرت پیاسی تھی اور ہماری عقل کو وہی روٹی ملی ہے جس کے ہم بھوکے تھے۔

"فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا" (یہ خدا کی ساخت کا نتیجہ ہے جس پہ انسان بنایا گیا ہے۔

خدا کی ذات کے متعلق فلسفیانہ دلائل

عجیب بات ہے کہ ایسی آسان بات کو مذہب کے نادان دوستوں نے عقلی پیچیدگیوں کی بھول بھلیاں بنا لیا اور اسی بنیاد پہ اس کے انکار اور اقرار کے متعلق ہر ملک کے اہل علم نے دفتر کے دفتر تیار کر دیے حتیٰ کہ سعدی کو گھبرا کر کہنا پڑا۔

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عاقلاں جز خدا ہیچ نیست

حالانکہ اس سے زیادہ غیر فطری طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ تجربہ اور دعوی

Marfat.com

تو لیا جائے ان لوگوں سے جو وحی و نبوت کی غیر معمولی قوتوں سے سرفراز ہیں اور تفہیم واستدلال میں کاسہ لیسی کی جائے ان محروماں سراپہ دۂ راز کی جن کے متعلق بہ تفصیل معلوم ہو چکا ہے کہ اپنے ذہنی کیسوں اور عقلی پھندوں میں چند لایعنی وسوسوں کے سوا وہ کچھ نہیں رکھتے۔ ولیم جیمس نے ان ہی غیر فطری دلائل کے طومار کو دیکھ کر لکھا تھا کہ:۔

وہ بڑے بڑے دفتر جن میں خدا کو ثابت کیا جاتا تھا اور جو ایک صدی پہلے یقینی سمجھے جاتے تھے آج وہ سب ایسے حقیر ہو گئے ہیں کہ کتب خانوں میں بجائے ان کے خاک بھر دی جائے تو بہتر ہے۔"

"جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا ہے اُن میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہوتے ہیں جو خدا کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں۔"

Marfat.com

اثبات خدا کے متعلّق مذہب کی راہ

خدا کے خود بخود ہونے کا عقیدہ

عام طور پہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ نظام ہستی میں ایک وجود تو خود بخود ہے جس کا نام خدا اور خالق ہے، دوسری چیزیں وہ ہیں جو دوسرے سے پیدا ہوتی رہتی ہیں اور ان ہی کو مخلوق کہا جاتا ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ مخلوقات کا انکار ناممکن ہے لیکن خدا یعنی وہ ہستی جو خود بخود ہو اس کا اقرار مشکل ہے، حالانکہ سوچا جائے تو معاملہ بالعکس نظر آتا ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ دوسرے سے پیدا ہونے والی ہستیوں کا انکار کر دیا جائے۔ اور انسانوں میں ایک بڑا گروہ ہے جس کا خیال ہے کہ قرآن کی آیت ھوالاوّل والآخر والظاھر والباطن کا یہی مطلب ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں :-

ما عدمہائیم و ہستیہائے ما
تو وجود مطلق فانی نما

اگرچہ فی الحقیقت یہ بھی ایک مشاہدہ کا انکار ہے اور اس کا جو صحیح مطلب ہے اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے ــــــــ بہر حال ہستی کے جس سمندر بے پایاں کی

Marfat.com

صرف ایک موج میں ان لشکروں کا تماشہ ہو رہا ہو اور خود مولانا روم کو ہو رہا ہو کہ :-

لشکرے ز اصلاب سوئے اُمہات بہرآں تا در رحم روید نبات
لشکرے از ارحام سوئے خاکداں تا ز نرّ و مادہ پر گردد جہاں
لشکرے از خاکداں سوئے اَجل تا بہ بیند ہر کسے حُسنِ عمل

تو جہاں یہ ہو رہا ہو، دُوسرے سے پیدا ہونے والی ہستی کے انکار کی وہاں کیا گنجائش ہے، یہی وجہ ہے کہ بے چارہ غالبؔ باوجودیکہ مخلوق کے وجود سے انکار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن پھر بھی گھبرا کر پوچھتا ہے :-

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

تاہم مخلوقات یعنی دوسرے سے پیدا ہونے والی ہستیوں کے وجود میں لوگوں نے شک کیا ہے۔ لیکن خود بخود ہونے والی ہستی کے انکار کی انسانی دماغ میں قطعاً گنجائش نہیں۔

خود بخود ہونے والی ہستی کا انکار بھی اس کا اقرار ہے

آخر انسان کیا کر سکتا ہے

اگر نظامِ ہستی میں خدا کا انکار اس لیے کرتا ہے کہ کسی خود بخود ہستی کا تصوّر اس کے لیے ممکن نہیں تو اب وہ کس چیز کا اقرار کرے گا؟ یہی نا کہ نظامِ ہستی کی بنیاد خدا پر نہیں بلکہ ایسی ہستی پر ہے جو خود بخود ہے۔ اور یہی تو خدا کے تجربہ کا پہلا جُز تھا دیکھو کہ خدا کے لفظ کا جس نے انکار کیا تھا پلٹ کر پھر اسی جز کا اس نے اقرار کر لیا۔ فطرتِ انسانی کی یہی وہ مجبوری ہے کہ اس حد تک مادہ پرست اور خدا

Marfat.com

پرست دونوں اس خود بخود ہستی کے اقرار پر اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ خدا پرست تو خدا کا اقرار کر کے اس خود بخود ہستی کا اقرار کرتا ہے اور مادہ پرست خدا کا انکار کر کے .... اس خود بخود ہونے والی ہستی کا اقرار کر بیٹھتا ہے جس کا نام وہ مادہ رکھتا ہے بہرحال اس نقطہ تک دونوں گروہوں میں صرف نزاع لفظی ہے ایک اس خود بخود ہستی کا نام خدا رکھتا ہے اور دوسرا مادہ۔ ہاں ان میں حقیقی اختلاف، صفات کی آئندہ تشریحات میں پیدا ہو جاتا ہے۔ پیغمبروں نے اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر ان غیر محدود کمالات اور برکات کو اس خود بخود ہستی میں پایا ہے جن کی جلوہ آرائیاں محدود پیمانہ پر کائنات کے مختلف طبقات میں ہمارے سامنے ہو رہی ہیں اور مادہ پرستوں نے بے دیکھے بے جانے یہ بے پر کی اڑا دی کہ نظام ہستی میں جن کمالات اور اوصاف کی نمائش ہو رہی ہے ان سے خود بخود ہونے والی ہستی جس سے سب ہوئے ہیں مفلس ہے۔

بہرحال اس کی بحث تو آئندہ آئے گی، اس وقت تو مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ جس خود بخود ہستی پر ایمان لانے کی پیغمبروں نے دعوت دی ہے، انسان اس کے سوا کچھ مان بھی نہیں سکتا اور آپ نے دیکھا کہ فطرت اور عقل اس کے متعلق کتنی مضطر ہے اقرار کرتے ہیں تو اقرار ہے انکار کرتے ہیں تو وہ بھی اقرار بن جاتا ہے اس سے زیادہ یقینی حقیقت ہمارے لیے کیا ہو سکتی ہے۔

عام طور پر جو مشہور ہو گیا ہے کہ خدا کا اثبات نہایت دشوار ہے اس کی وجہ

Marfat.com

یہ ہے کہ عوام الناس میں یہ خیال پھیل گیا ہے کہ نظامِ ہستی کو مذہب دوسرے سے پیدا شدہ مانتا ہے ، حالانکہ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ہستیاں دوسرے سے نکل رہی ہیں اُن کو ہم دوسرے سے پیدا شدہ مانتے ہیں تو بتایا جائے کہ مذہب اس کے سوا اور کیا مانے ؟ اور اگر یہ مطلب ہے کہ ہستی کے اس نظام کو مذہب والے کسی خود بخود ہونے والی ہستی پر ختم نہیں کرتے ہیں تو یہ بالکل غلط ہے ۔

ہم جو کچھ محسوس کر رہے ہیں پیغمبر بھی اس کو ایک خود بخود ہستی کا جلوہ اور اثر قرار دیتے ہیں ۔ اور جو پیغمبروں سے باغی ہیں وہ بھی اس کے سوا کچھ سوچ نہیں سکتے ، کیونکہ پیغمبروں کے نزدیک ہستی کا نظام خدا سے وابستہ ہے اور خدا چونکہ خود بخود ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ہستی کا سارا نظام اُن کے نزدیک ایک خود بخود ہستی کا نظام ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ مذہب کائنات کی بنیاد ایک ایسی ہستی پر قائم کرتا ہے جو خود بخود ہے اور اسی بنیادی وجود کا نام مذہبی زبان میں خدا ہے ، اس کا حاصل بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہستی کا نظام ایک خود بخود ہستی کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ ایک ایسی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جنہوں نے اس کا انکار کیا ہے مجبور ہو کر اسی کا اُن کو پھر اقرار کرنا پڑا ہے ۔ آخر خدا کے منکروں میں جو اپنے آپ کو شمار کرتے ہیں اس کے سوا وہ اور کیا مانتے ہیں کہ ہستی کا یہ سارا نظام ایک خود بخود ہستی جس کا نام وہ کچھ ہی رکھیں اُسی کا مظہر ہے ان مسکینوں سے پوچھنا چاہیے کہ اس حد تک مذہب بھی اور کس بات کا مدعی ہے بس واقعہ یہ ہے کہ خود بخود ہستی پر ہستی کے اس نظام کا اختتام اور انتہا اس کا اقرار بھی اقرار ہے اور اس کا انکار بھی اسی کا اقرار ہے اسی لیے کہتے ہیں کہ :۔

Marfat.com

کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

خداوند قدوس کی ہمیشگی

اور جس طرح عقل کے لیے یہ ایک بدیہی حقیقت ہے اُسی طرح ہم اس بات کے سوچنے سے بھی قطعاً عاجز ہیں کہ بغیر لکڑی کے یکایک کرسی پیدا ہوگئی ہے ۔ ہم جو کچھ جانتے ہیں یا جان سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ ہمیشہ ہستی ہستی ہی سے پیدا ہو سکتی ہے ۔ فطرت انسانی میں قطعاً اس کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ نیستی محض سے ہستی کے نکلنے کا تصور کر سکے ، پس وہ خود بخود ہستی جس کے ساتھ نظام ہستی وابستہ ہے اگر اس کے متعلق کوئی یہ سوچے کہ ایک زمانہ تک وہ نہ تھا پھر یکایک وہ ہوگیا ، تو اس کے یہ معنی ہوئے نیستی یعنی عدم سے وجود پیدا ہوا حالانکہ میں بتا چکا ہوں کہ اس مفہوم کے سوچنے کی ہم میں قطعاً گنجائش نہیں اور یہی مراد ہے پیغمبروں کے اس تجربہ کی جہاں خداوند قدوس کا وجود خود بخود ہے ، اسی کے ساتھ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے بھی ہے جس کا حاصل یہی ہے کہ ہستی ہی سے نکلی ہے اور ہستی ہمیشہ سے ہے اور رہے گی ۔

آریائی مادہ اور رُوح کا فالتو وجود

سُنا جاتا ہے کہ بازاروں میں آریوں نے یہ غُل مچا رکھا ہے کہ مسلمانوں کا ایک عام عقیدہ یہ بھی ہے کہ عالم نیست محض سے ہست ہوا ہے ۔ حالانکہ پیغمبروں کا تجربہ یہ ہے کہ موجودہ نظام ہستی ایک خود بخود ہستی کی جلوہ گاہ ہے اور اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہستی ہستی ہی سے پیدا ہوئی ہے اور مسلمان جب اس خود بخود ہستی کو جس پر کائنات کی بنیاد قائم ہے ازلی مانتے ہیں یعنی کہتے ہیں کہ وہ نیست سے ہست نہیں ہوا ہے یا یہ کہ " وہ نہ تھا اور پھر ہو گیا " ایسا نہیں ہے ، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ سے ہے

Marfat.com

تو پھر ان آریوں کی یہ تہمت نہیں تو اور کیا ہے ؟ — سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمان جب عالم کو خدا سے پیدا شدہ مانتے ہیں تو ہستی سے ہستی کو نکلی ہوئی تسلیم کرتے ہیں یا نیستی سے عالم کو نکالتے ہیں ؟ بلاشبہ جس کا عقیدہ یہ ہو کہ خدا نہ تھا اور پھر کچھ مدت کے بعد ہست ہوا ، اُن پر ضرور یہ سوال وارد ہو سکتا ہے کہ نیستی سے ہستی کس طرح پیدا ہوئی ؟ لیکن جو خدا کی ہستی کو ہمیشہ ہمیشہ سے ازلی مانتے ہیں اُن کے متعلق یہ کہنا کہ وہ نیستی سے ہستی کے پیدا ہونے کے قائل ہیں بالکل عجیب بات ہے ۔ قرآن پاک میں اسی نظریہ کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے ۔

ام خلقوا من غیر شیئٍ ام ھم الخالقون ۔

(کیا انسان نیست محض (غیر شے) سے پیدا ہوا ہے ؟ یا اُس نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا ہے ؟) ظاہر ہے کہ نیستی سے ہستی کی پیدائش کو ہم سوچ ہی نہیں سکتے اور اس سے بھی زیادہ جھوٹ یہ ہو گا کہ ہم اپنے آپ کو اپنا خالق مانیں ۔

Marfat.com

توحید

آریوں نے مسلمانوں پر یہ الزام لگا کر" وہ نیستی سے ہستی کے پیدا ہونے کے قائل ہیں" اپنا ایک خود تراشیدہ وہم یہ پیش کیا ہے کہ" عالم صرف خدا سے نہیں بلکہ مادہ سے بھی ظاہر ہوا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس فطری یقین کو محفوظ رکھنے کے لیے کہ" ہستی ہستی ہی سے پیدا ہوتی ہے۔" خدا کی ہستی کیوں کافی نہ تھی جو مادہ کے وجود کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہستی کو ہستی ہی سے پیدا ہونا چاہیے یہی پیغمبروں کا مشاہدہ بھی ہے کہ موجودہ نظام ہستی اس ہستی سے ظاہر ہوا ہے جس کا نام خدا ہے پھر خدا کے پہلو میں کسی فالتو ہستی (مادہ یا روح) کے اضافہ کی کیا ضرورت ہے۔ قرآن پاک میں توحید کے جہاں اور دلائل بیان کیے گئے ہیں ان میں زیادہ زور اسی دلیل پر ہے کہ ہستی کی پیدائش کے لیے خدا یعنی ایک خود بخود ہستی کے ماننے کے لیے تو آدمی یقیناً مجبور ہے لیکن اس ہستی کے سوا کسی اور خود بخود ہستی کی ضرورت کیوں بتائی جاتی ہے قرآن کا ارشاد ہے کہ کسی کے پاس کوئی دلیل کوئی شہادت ہو تو پیش کرے [1]

---

[1] ان لوگوں پر حیرت ہے جنہوں نے توحید جیسے آسان اور سہل مسئلہ کو طریقہ بحث

Marfat.com

قُلْ أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ قُلْ لَا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ ۝

(یعنی پوچھیے) کیا تم مشرکین اس کی شہادت دیتے ہو کہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ اے پیغمبر کہیے کہ میرے پاس اس کی شہادت نہیں ہے۔ اور کہیے کہ وہ تو یکتا واحد معبود ہے اور بلاشبہ ہم اُن سے قطعًا جُدا ہیں جنہیں تم اللہ کا

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی غلطی سے خواہ مخواہ ایک پیچیدہ مسئلہ بنا دیا ہے۔ ورنہ قرآن نے اس سلسلہ میں جو فطری راہ پیش کی تھی فیصلہ کے لیے وہی کافی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ شرک و توحید پر بحث کرنے سے پیشتر یہ طے کر لینا چاہیے کہ ان دونوں دعووں میں کس دعوی کی حیثیت اثبات کی ہے اور کس کی حیثیت انکار کی ہے ظاہر ہے کہ ایک خدا کو مان کر مشرک ہی دوسرے خدا کا اضافہ کرنا چاہتا ہے پس مدعی تو مشرک ہی ہے رہا موحد تو اس کا مقام صرف انکار کا مقام ہے یعنی مشرک کے اضافہ کردہ خدا کا وہ صرف انکار کرنا چاہتا ہے بحث و تحقیق کا عام قاعدہ ہے کہ صرف مدعی ہی پر بارِ ثبوت ہے، منکر کے لیے صرف انکار کافی ہے افسوس ہے کہ قرآن نے توحید کے باب میں یہی فطری راہ پیش کی تھی لیکن ہمارے متکلمین کا ایک گروہ بلا وجہ مدعی بن بیٹھا اور محض اس غلط طریقہ کی وجہ سے ان کو تمانع وغیرہ اقناعی دلائل پیش کرنے پڑے اور لطف یہ ہے کہ توڑ مروڑ کر قرآنی آیتوں کو بھی ان خود ساختہ دلائل پر منطبق کرنا پڑا۔ جس دلیل کا نام متکلمین نے "برہان تمانع" رکھا ہے اور قرآن کی جس آیت سے وہ اُسے نکالنا چاہتے ہیں آئندہ اوراق میں اس آیت کی ایک جدید توجیہ آپ کو نظر آئے گی۔ ضرورت ہے اس پر خاص توجہ کی جائے ۱۲۰

Marfat.com

ساجھی ٹھہراتے ہو)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَاۗءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝	(یہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے تراش لیے ہیں۔ اللہ نے اس کے متعلق کوئی دلیل نہیں اُتاری یہ مشرکین صرف اٹکل پچو باتوں اور اپنی خواہش کے پیچھے چلے جا رہے ہیں

حالانکہ ان کے پروردگار کی رہنمائی اُن کے سامنے آچکی ہے)

ایک اور جگہ مسلمانوں سے چیلنج دلایا گیا ہے کہ ان کے خالص معبودوں کے متعلق ان مشرکین کے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کریں :-

هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۝ ۔	(یعنی ہماری قوم کے لوگوں نے اللہ کے سوا جو معبود بنا لیے ہیں کیوں نہیں وہ کھلی دلیل اس پر لاتے ہیں)

بہرحال اسی مسلک کی طرف قرآن نے اعلان کیا ہے کہ

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ ۝	(اور خدا کے سوا جو دوسرے معبود کو پکارتا ہے اُس کے پاس اس دعویٰ کی

کوئی دلیل نہیں ہے)

توحید کے سلسلہ میں قرآن کا لازوال اور لاجواب مطالبہ

توحید کے متعلق قرآن اس ٹھوس

مطالبہ سے بھرا ہوا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس مطالبہ کا کوئی نہ کوئی جواب کسی نے اب تک دیا ہے اور نہ کبھی کوئی دے سکتا ہے ۔ صرف خیر و شر کی تقسیم سے مغالطہ کھا کر قدیم ایرانی فلاسفروں کے ایک گروہ نے یزدان کے ساتھ اہرمن کے وجود کے اضافہ کو عقل کا تقاضا ٹھہرانا چاہا ہے ۔ اس مسئلہ پہ ہم فلسفہ غم کے تحت میں کافی بحث کریں گے لیکن پارسیوں سے اتنا اس وقت ہی پوچھتے چلنا چاہیے کہ تمہاری مراد خیر و شر سے کیا ہے ؟ اگر خیر سے نفع بخش اور شر سے ضرر رساں چیزیں مراد ہیں تو کیا اس قسم کے خیر کا وجود شر سے علیحدہ ہو کر پایا جاتا ہے ؟ اگر ایسا ہوتا تو شاید شر کے لیے علیحدہ خالق کی تلاش ممکن بھی تھی ، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جس آگ سے ہمارے گھر جلتے ہیں اسی سے کھانا بھی پکتا ہے اور جس پانی سے اناج پیدا ہوتا ہے اسی سے طوفانی مصائب بھی آتے ہیں اور علیٰ ہذا جس آفتاب کے نور و حرارت سے روشنی ملتی ، توانائی پیدا ہوتی اور کھیتی پکتی ہے اُسی کی حرارت سے کھیتیاں جُھلس بھی جاتی ہیں ۔

الحاصل ایک ہی چیز کے صحیح استعمال سے نفع بھی ہوتا ہے اور استعمالی غلطی سے وہی چیز شر بھی بن جاتی ہے ۔

اضداد کی باہمی آویزش اور مسئلہ توحید

ہر حال جب خیر کا وجود شر سے علیحدہ ہو کر نہیں پایا جاتا ہے بلکہ استعمالی غلطی سے خیر ہی شر بن جاتا ہے تو ایک کے لیے دو خالق کی تلاش نہ صرف فضول بلکہ قطعاً غلط ہے ۔ لہٰذا پارسیوں کے دو خداؤں میں سے بھی ایک اُسی طرح فالتو ہو جاتا ہے جس طرح آریوں کا مادہ اور رُوح ہاں اگر بجائے خیر و شر

Marfat.com

کے یہ کہا جائے (اور غالبًا ایرانی فلاسفہ کی یہی مراد بھی ہوگی) کہ نظامِ عالم کی بنیاد متضاد قوتوں پہ مبنی نظر آتی ہے۔ نیستی کے ساتھ ہستی اور حیات کے ساتھ موت لگی ہوئی ہے حرارت کے ساتھ برودت اور رطوبت کے ساتھ یبوست علیٰ ہذا سکون کے ساتھ حرکت اور ضعف کے ساتھ قوت کے مظاہرے یہاں ہر آن اور ہر لمحہ دیکھے جاتے ہیں تو ان تماشوں کا کون انکار کر سکتا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ مظاہر فطرت میں شاید ہی کوئی ایسی صفت ہوگی جس کی ضد یہاں موجود نہ ہو، لیکن کیا اس سے بجائے ایک کے دو کی ضرورت ثابت ہوتی ہے؟ تم اضداد کو دیکھتے ہو لیکن ان اضداد کی باہمی آویزشوں اور پیچیدہ پیوستگیوں سے آنکھیں کیوں بند کر لیتے ہو ـــ غور تو کرو! بے چاری عقل جو دو ضدوں کے باہمی اجتماع کو سوچ بھی نہیں سکتی، اسی کی پیٹھ پہ کائنات کے اُن غیر محدود لامتناہی اضداد کی کثرتوں کے اجتماع کے بوجھ کو کیسے لادا جا سکتا ہے۔ جب تک کسی شیرازۂ وحدت کے ساتھ انھیں جکڑا نہ جائے؟ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے:۔

وما کان معہ من الٰہ اذاً	(اللہ کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے
لذھب کل الٰہ بما خلق ولعلیٰ	اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی مخلوق کو
بعضھم علیٰ بعضٍ ط	(یا ہر الٰہ اپنے مظاہر و آثار کو لے

بھاگتا اور بجائے آویزش و ترکیب کے ایک دوسرے پہ چڑھ جاتے۔

اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو ہستی کے جس نظام کی بنیاد انھیں اضداد پہ قائم ہے کیا وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی قائم رہ سکتا تھا؟ رطوبت کے مظہر پانی کو حرارت کے مظہر آگ کو الغرض اس قسم کے اضداد کے مظاہر میں سے کسی ایک

Marfat.com

چیز کو نکال لو! تو کیا پھر یہ دنیا یہی دنیا رہ سکتی ہے ؟ قرآن میں وحی کا اگر یہ تجربہ پیش کیا گیا ہے کہ

لو کان فیہما اٰلہۃٌ اِلاَّ اللہ لفسدتا ۔ (یعنی اگر آسمان و زمین میں خدا کے سوا اور کوئی معبود ہوتا تو یہ دونوں برباد ہو جاتے)

خود غور کرنا چاہیے کہ پیغمبروں کے اس مشاہدہ کے سوا کیا عقل کچھ اور بھی سوچ سکتی یا مان سکتی ؟ بلا شبہ ہم سے وہی منوایا گیا جس کے سوا ہم کچھ مان ہی نہیں سکتے اور وہی سمجھایا گیا جس کے سوا ہم کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے ۔

حقیقت یہ ہے کہ اضداد کے جس ایرانی فلسفہ کو پیغمبروں کے تجربۂ توحید میں شک اندازی کے لیے پیش کیا گیا تھا کیسی عجیب بات ہے کہ یہی فلسفہ اُلٹ کر شرک کے گلے کا پھندا بن گیا اور لے دے کر توحید کے دشمنوں کے ہاتھ میں یہی ایک حربہ تھا ۔ آخر اضداد کا یہ مجموعہ جو باہم اتنی سختیوں کے ساتھ جکڑا ہوا ہے ۔ موحد اگر اسے جکڑا ہوا مانتا ہے تو کیا بکھرا ہوا مانے ؟ سچ کو جھوٹ نہیں بنایا جا سکتا اور بلا شبہ وحی اور نبوت کے تجربات اور مشاہدات کا انکار بغیر اس کے ہو نہیں سکتا ۔ قرآن نے سچ فرمایا ہے :۔

ومن یّرغب عن ملّۃِ ابراہیم اِلاَّ مَنْ سَفِہَ نفسہٗ ۔ (یعنی ابراہیم کی ملت " دین اسلام " اور دین فطرت سے وہی کترا سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو احمق و سفیہ بنا لیا ہو)

Marfat.com

پارسیوں کو اپنی کتاب کا صحیح علم نہیں ہے۔ ورنہ قرآن کی اس آیت کا ترجمہ ان کو اپنی کتابوں میں بھی ملتا، ژند اوستا میں زرتشت کی طرف یہ عبارت منسوب کی گئی ہے:-

"نیک اندیشوں اور سچے خیال والوں کے نزدیک اہرمزد را رب دو جہان ہے، جو لوگ بتوں کے خیال میں منہمک رہتے اور مشرک ہیں یا وہ جو شرارت یا بدنفسی میں مبتلا رہتے ہیں رذیل ہیں۔"

(ژند اوستا حصہ پا سا)

الحاصل حق سبحانہ تعالیٰ کا خود بخود موجود ہونا، ہمیشہ ہمیشہ سے ہونا، ایک ہونا، نبوت کے یہ ایسے روشن تجربات ہیں جن کے اقرار پہ وہ مجبور ہیں جو بے دیکھے بے جانے خدا کا بلا وجہ انکار کرنا چاہتے ہیں، اور اسی لیے میں نے کہا تھا کہ ان حدود تک مذہب اور لامذہبیت میں کوئی اختلاف نہیں، پیغمبروں سے جو باغی ہیں ان کو بھی یہی ماننا پڑتا ہے اور ایمان لانے والوں کا بھی یہی عقیدہ ہے۔

Marfat.com

مسئلہ صفات

خدا پرستوں اور منکرین خدا کے درمیان اختلاف کا حقیقی خط

بہرحال مادہ اور خدا کے متعلق یہاں تک جتنے جھگڑے ہیں صرف لفظوں کی لڑائی ہے۔ البتہ اس کے بعد پیغمبرانہ تجربات حق تعالیٰ کے لامحدود کمالات اور صفات اعلیٰ یا اسماءِ حسنیٰ کے متعلق جن واقعات کا مشاہدہ اور علم حاصل کیا ہے حقیقی اختلاف کی سرحد یہیں سے شروع ہوتی ہے اور دراصل پیغمبروں اور دہریوں کی بحث کا اصل خطِ جنگ یہی ہے انبیاء علیہم السلام کا مشاہدہ ہے کہ جس خود بخود ہستی کی یہ عالم نمائش گاہ ہے وہ ان تمام کمالات سے موصوف ہے جن کو ہم کائنات کے طویل و عریض سلسلہ میں مختلف نوعیتوں کے ساتھ مختلف پیمانوں پر مشاہدہ کر رہے ہیں، مثلاً یہاں زندگی، حیات علم، بینائی، شنوائی، ارادہ، قدرت، اختیار، قوت اور اسی قسم کے جتنے کمالات اور فیوض ہیں جن کی غیر محدود موجیں مختلف صورتوں میں محسوسات کے مختلف مظاہر میں چاروں طرف سے اُبل رہی ہیں پیغمبروں کا دعویٰ ہے کہ اُن ہی کمالات کے ساتھ حق سبحانہٗ تعالیٰ اپنی شانِ اعلیٰ کے مطابق موصوف ہیں لیکن مادہ پرست

Marfat.com

منکر مذہب اس کے برخلاف مدعی اور صرف مدعی ہے۔ کیوں کہ یہ تفصیل معلوم ہو چکا ہے کہ سرچشمۂ صفات تک عقل و حواس کے ذریعہ سے رسائی قطعًا ناممکن ہے۔ بہرحال مادہ پرستوں و منکرین خدا کا یہ گروہ بے دیکھے، بے جانے بے سمجھے اپنے اس وہم میں گرفتار ہے کہ وہ خود بخود ہستی جس پہ نظام کائنات کی انتہا ہوتی ہے ان تمام کمالات سے مفلس اور عاری ہے اور اسی لیے انھوں نے اپنے آپ کو پیغمبروں سے جدا کرنے کے لیے اس خود بخود ہستی کا نام بجائے خدا کے مادہ رکھ لیا ہے۔ مادہ کا ترجمہ یہ ہے کہ وہ خود بخود ہستی جس پہ نظام عالم کی بنیاد قائم ہے اور اُن تمام کمالات سے وہ معرا ہے جو خدا کے لیے ثابت کیے جاتے ہیں۔ قرآن پاک کی جن دلیلوں کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اثباتِ خدا کے دلائل ہیں دراصل اُن کا زیادہ تر تعلق صفات ہی کے اثبات سے ہے میں چاہتا ہوں کہ قرآنی روشنی میں نبوت کے اس مشاہدہ اور تجربہ کے متعلق یہ دکھاؤں کہ عقل و فطرت میں بھی ان دعووں میں سے کس دعوے کے ماننے کی گنجائش ہے اور کس کے انکار پہ ہم مجبور ہیں۔

نابود کے نمود کا دعویٰ مسئلہ صفات کے متعلق مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے یہ عجیب و غریب سوال پیش کیا ہے کہ "نہ تھا تو ہوا کہاں سے"

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہم جن کمالات و اصاف کو ہستی کے مختلف مظاہر میں محسوس کر رہے ہیں مثلاً ارادہ، اختیار، حیات، علم، بینائی، شنوائی، قدرت وغیرہ کے متعلق مادہ پرستوں کا یہ وہم یعنی بغیر جانے ہوئے یہ ادعا ہے کہ ابتدا میں ہستی اُن کمالات سے بالکل مفلس تھی، اس میں نہ زندگی تھی نہ علم تھا، نہ ارادہ، نہ

Marfat.com

شعور، غرض کچھ نہ تھا، پھر رفتہ رفتہ ارتقاء کے مختلف مدارج کو خود بخود طے کرتے ہوئے ان نابود اور معدوم صفات کا اس میں نمود اور بود شروع ہوا، جس کا حاصل یہی ہوا کہ ان لوگوں کے نزدیک جو نہ تھا وہ ہوا اور ہو رہا ہے، سوچنا چاہیے کہ وہی عقل جو نیست محض کے ہست ہونے کی سوچ نہیں سکتی تھی، جس کے نزدیک نیستی سے ہستی کی پیدائش ایک ناقابلِ تصور خیال تھا، اُسی عقل اور اُسی فطرت میں کیا یہ عجیب و غریب دعوے سما سکتا ہے کہ جو نہ تھا اُس کے ہونے کا یقین کرے آخر جس میں زندگی نہ تھی اُس سے زندگی، جس میں علم نہ تھا اس سے علم، جس میں ارادہ نہ تھا اس سے ارادہ، جس میں اختیار نہ تھا اس سے اختیار، جس میں قدرت نہ تھی اس سے قدرت نکلنے کے کیا یہی معنی نہ ہوئے کہ جو نہ تھا وہ ہوا، جو نیستی تھی وہ ہستی بنی[1]؟ سچ یہ ہے کہ انسان جب تک اپنی موجودہ عقل اور فطرت کو برباد نہ کرلے اس وہمی دعوے کے آگے سر جھکانے کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہو سکتا، کسی نے کہا ہے کہ لامذہبیت کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان میں لاعقلیت پیدا ہو جائے" اب آؤ اس کے مقابلہ میں ان تجربات

---

[1] پروفیسر اسٹارٹ ذہنی صفات کی نیرنگیوں کا اندازہ کرتے ہوئے اس بے ربطی کو جو مادہ اور ذہنی مظاہر میں ہے ان الفاظ میں ادا کرتا ہے جہاں کہیں سے بھی ذہن شروع ہوتا ہوا سمجھا جائے وہ اس طرح ناگہانی طور پر نمودار ہوتا ہے جس طرح طپنچہ سے گولی جو طپنچہ میں پہلے سے موجود نہ ہو...... ذہن کا مادہ سے پیدا ہونا مادی دنیا میں فطرت کے سارے نظام کے منافی و متناقض ہے، یہ گویا عدم سے، وجود کی تخلیق کے معجزہ کا قائل ہونا ہے (کتاب مائنڈ اینڈ میٹر ص۱۱۲)

Marfat.com

اور مکاشفات کو سنو جو دنیا کے ہر خطہ اور ہر آبادی کے برگزیدہ اور راست باز انسانوں نے اُن انسانوں سے پیش کیے ہیں جن پہ فطرت انسانی نے سب سے زیادہ اعتماد کیا ہے، یعنی وحی اور نبوت والوں کا ارشاد سنو، ابھی اس سے بحث نہیں کہ زندگی کیا چیز ہے؟ علم کی حقیقت کیا ہے؟ ارادہ کی تعریف کیا ہے؟ لیکن اتنا تو سب کو معلوم ہے کہ ہستی کے یہ وہ اوصاف ہیں جنھیں وجود کا کمال اور اُس کی خوبی سمجھی جاتی ہے، جس سے بینائی جاتی رہتی ہے ہم اس اندھے کو ناقص سمجھتے ہیں۔ یہی حال تمام کمالات کا ہے۔

بہرحال پیغمبروں کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان جن چیزوں کو کمال سمجھتا ہے یا کمال سمجھ سکتا ہے، کائنات کا بنیادی وجود ان تمام کمالات سے ازلاً اور ہمیشہ سے موصوف ہے۔ مطلب کیا ہوا؟ یہی کہ ہمارے سامنے "نابود" کی "نمود" اور "بود" ہو رہی ہے، جو نہ تھا وہ نہیں ہوا بلکہ جو تھا وہی ہوا اور وہی ہو رہا ہے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ جو تھا وہی ہوا اور وہی ہو رہا ہے، عقل کے لیے اس کا ماننا آسان ہے۔ یا "جو نہ تھا وہی ہوا اور ہو رہا ہے۔" اس دشوار اور جھوٹی حقیقت کو فطرت اپنے اندر اُتار سکتی ہے؟ اس مسخرے نے سچ کہا تھا کہ میں بھینس سے انڈا اور انڈے سے روغن گل اور روغن گل کے ساتھ کل دو اُبس بھینس کے انڈے سے کس طرح نکالوں؟ مگر مادہ پرست اسی کے ماننے پر آدمی کو مجبور کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ یہی عقل کی بات ہے، سوچو! کیا اس سے بڑے درجہ کی کھلی کوئی سفاہت اور دیوانگی ہوسکتی ہے؟

صفات کے متعلق قرآن کا طریقہ خاص | "الحمد للّٰہ رب العالمین"

Marfat.com

قرآن مجید کی پہلی سورت، فاتحہ کی پہلی آیت ہے جس میں بجائے ذات کے (جو متفقہ مسئلہ ہے) خدا کی صفات کے اثبات سے مذہب کے درس کی ابتدا کی گئی ہے کیونکہ مذہبیت ولا مذہبیت کے اختلاف کا پہلا اصولی نقطہ جیسا کہ معلوم ہو چکا یہی ہے آیت کا حاصل یہ ہے کہ جس کسی کی جہاں کہیں بھی کوئی تعریف و ستائش کی جائے وہ اسی اللہ کے لیے ہے جو عالمین (یعنی تمام وہ چیزیں جو ہمارے علم کی گرفت میں آرہی ہیں) کی تربیت کرنے والا ہے یعنی بتدریج کسی کمال الٰہی کا اسے مظہر بنا رہا ہے، مثلاً ایک نطفہ میں بتدریج ان کمالات کی نمائش کرتا ہے جسے ہم انسانی کمالات کہتے ہیں۔ لوگ جب ابتدا میں قرآن کے اس دعوے کو سنتے ہیں تو انھیں حیرت ہوتی ہے کیونکہ اس دنیا کا ہر ذرہ کوئی نہ کوئی کمال رکھتا ہے اور ہر ایک اپنے اپنے کمال کے مطابق سراہا جاتا ہے تو پھر یہ کہنا کہ سارے کمالات اور ان کمالات کی ساری تعریفیں خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں ایک عجیب سی بات ہے لیکن بات سمجھی نہیں گئی یہی

ؔ اس مقام سے اس راز کا انکشاف ہو سکتا ہے کہ قرآن نے اپنے درس کی ابتدا الحمد للہ رب العالمین سے کیوں کی؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا ذات کی حد تک تو خدا کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، دونوں ہی عالم کے اس نظام کو ایک خود بخود ہستی کا نظام مانتے اور اسی خود بخود یہ اس نظام کو ختم کرتے ہیں، پس مانی ہوئی چیز کے منوانے کی حاجت ہی کیا تھی، اختلاف کا نقطہ تو صفات سے شروع ہوتا ہے اسی لیے قرآن نے اسی سے اپنی بحث کا آغاز کیا۔ ۱۲

Marfat.com

تو قرآن پوچھنا چاہتا ہے کہ ہستی کے ہر ذرّہ میں جن کمالات اور خوبیوں کی نمائش ہو رہی ہے کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ نہ تھے اور ہو گئے ہیں؟ کیا تمہاری عقل اس بات کو سوچ سکتی ہے کہ نیستی سے ہستی بنی؟ پس جب ایسا نہیں ہے تو یقین کرو کہ جہاں کہیں، جس کسی میں جب کوئی ایسا کمال نظر آتا ہے جس کی تعریف کی جاتی ہے تو ان سب کا مرجع اور سرچشمہ وہی ازلی وجود ہے جو ان کمالات سے ازلاً و ابداً موصوف تھا اور ہے، اور جو ہمارے تمام محسوسات و معلومات (عالمین) کے آئینہ میں اپنے کمالات کو مختلف طریقوں سے چمکا رہا ہے اور وہ جو کائنات کے ہر ذرّہ کی ستائش و حمد کے گیت گاتے ہیں لیکن اپنی بدعقلی سے جو ان کا بنیادی وجود اور حقیقی سرچشمہ ہے اس کا مادہ نام رکھ کر ہر قسم کے کمالات سے بے بہرہ سمجھتے ہیں یا سمجھنا چاہتے ہیں صرف یہی نہیں کہ جو نہ تھا اس کے ہونے کا دعوٰے کر کے انسان کے اندرونی احساسات کو ذبیح و ذبح کر رہے ہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو فطرت پر اُن کے جاہلانہ مظالم کا سلسلہ بہت وسیع نظر آئے گا۔

مثلاً

قانونِ تناسب کی خلاف ورزی

اونٹ کے گزرنے کے لیے صرف یہ کہہ دینا کہ سوراخ موجود تھا اس لیے گزر گیا، کیا عقل کی تسلیم کے لیے اتنا کافی ہے؟ عقل اس بات کو کیا مان سکتی ہے کہ سوئی کے ناکہ میں بھی چونکہ سوراخ موجود ہے اس لیے اونٹ کو اس سے گزر جانا چاہیے؟ اس کی تسلیم سے عقل کیوں سرتابی کرتی ہے؟ ظاہر ہے کہ سبب و مسبب اثر و مؤثر میں کوئی تناسب نہیں ہے، پھر سوئی کے ناکے سے اُونٹ کے گزر جانے پر اصرار عقل کے ساتھ اگر ظالمانہ جبرہ دستی ہے تو کیا یہی ظلم عقل انسانی پر وہ نہیں کر رہے ہیں جو ہر قسم

Marfat.com

کے کمالات سے مفلس مادہ سے کائنات کے اس محیر العقول حیرت ناک نظام کو نکالنا چاہتے ہیں؟ آسمان و زمین، ثوابت و سیارے دریا، پہاڑ، حیوانات و انسان وغیرہ کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ یہ سب کہاں سے آئے؟ اب جو اس کے جواب میں مجبور و لاچار بے علم و بے جان مادہ کا نام بغیر کسی مشاہدہ اور تجربہ کے لیتا ہے۔ بتاؤ اس نے اپنی عقل پہ پتھر مارا، یا جو اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پہ خدائے قادر و توانا کا نام جپتا ہے اس نے ہماری فہم کے فطری قوانین کے ساتھ انصاف کیا؟ قرآن اپنے مختلف صفحات میں تناسب کے اس قانون پہ غور کرنے کے لیے کہتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی اثر اور معلول کے لیے کسی موثر کسی علت کا صرف فرض کر لینا کافی نہیں بلکہ علت و معلول اور اثر و موثر میں تناسب کا لحاظ بھی ضرور ہے کسی مجذوب نے سچ کہا تھا کہ "تم انگور سے ہاتھی کب تک ٹپکاؤ گے۔"

قانون ترتیب سے چشم پوشی

کیسی عجیب بات ہے کہ اس عالم میں دیکھتے ہیں کہ آنکھیں بن رہی ہیں۔ چند خاص پردوں کے ساتھ بن رہی ہیں ہر پردہ خاص قوانین کے تحت بن رہا ہے یہی آنکھیں حیوانات میں بھی بن رہی ہیں انسانوں میں بھی بن رہی ہیں امریکہ میں بھی بن رہی ہیں ایشیا میں بھی بن رہی ہیں ہر جگہ ہر پردہ اپنے قوانین کے تحت بن رہا ہے الغرض جس چیز کو دیکھو گے اس میں ایک خاص قسم کی ترتیب ایکسانیت اور ہمواری نظر آئے گی، اور کیسی ترتیب کیسی ہمواری؟ بقول بعض "فطرت کے قوانین کیا ہیں ایک بلیغ نظم، ایک ایسا موزوں شعر کہ اگر اس کا ایک لفظ بھی اپنی جگہ سے نکال دیا جائے تو سارا نظم شعری ہی بگڑ جاتا ہے" یہی حال اس عالم کا ہے کسی ایک چیز کو نکال کر دیکھو اور اندازہ کرو، بہر حال پوچھا جاتا ہے کہ یہ کس کی قدرت کے کرشمے ہیں؟ اب عقل کے ساتھ کیا تمسخر نہیں ہے

Marfat.com

کہ اس کے جواب میں اُس کا نام لیا جائے جس کو ہر قسم کی قدرت سے مفلس فرض کیا جاتا ہے۔

"افی اللہ شکٌّ فاطر السمٰوٰتِ والارض"

قوانین فطرت کے استحکام اور ہمہ گیری سے غفلت

آفتاب نکلتا ہے یا زمین گھومتی ہے، جو طریقہ تعبیر بھی اختیار کیا جائے۔ بہرحال ٹھیک چوبیس گھنٹوں میں یہ یومیہ دورہ ختم ہو جاتا ہے اور تین سو پینسٹھ دن اور کچھ منٹ وغیرہ میں یہ سالانہ گردش پوری ہوتی ہے، اور جس وقت تک کی تاریخ ہمارے پاس موجود ہے معلوم ہے کہ اس وقت سے یہی ہوتا رہا ہے اور اب بھی یہی ہو رہا ہے اور ایک آفتاب اور زمین ہی کیا، عالم کی ہر چیز چند ایسے اٹل قوانین کی گرفت میں جکڑی ہوئی ہے کہ آج ان ہی کے استحکام پر ہمارے تمام علوم و فنون کی بنیاد ہے، پوچھا جاتا ہے کہ ان دقیق، نازک، مضبوط اور مستحکم ہمہ گیر قوانین کی باگ کس کے ہاتھ میں ہے؟ قرآن پاک اس کے جواب میں کہتا ہے۔ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ۔

(یہ سب اس کے ناپنے اور جانچنے کا نتیجہ ہے جو ہر چیز پر غالب اور علم والا ہے)

بتاؤ! انسانی عقل کی تشنگی اس سے بجھتی ہے، یا اس جواب سے کہ کہا جائے۔

«ذٰلِكَ اتفاق المجبور الجاهل»

(یہ ایک لاچار اور علم و قدرت سے یکسر عاری مادہ کے اتفاقی اثرات کا نتیجہ ہے۔") اور سچ یہ ہے کہ اس قسم کی مضحکہ انگیز حماقتوں کا صدور ان ہی لوگوں سے

Marfat.com

ہوسکتا ہے جنھوں نے فطرت اور اس کے نازک استوار قوانین پر کبھی غور ہی نہیں کیا یا جن کی زندگی صرف فسق و فجور، مسخرگی اور اوباشی میں گزری ہو، ورنہ سچے سوچنے والوں نے ہمیشہ وہی کہا جسے پیغمبروں نے دیکھا، عہد جدید کا سب سے بڑا مفکر نیوٹن نے اپنے ایک معلوم کردہ قانون کے ذریعہ سے انسانی سمجھ کا رُخ پھیر دیا تھا، قانون جذب و کشش کی تشریح کرنے کے بعد لکھتا ہے :۔

"کائنات کے اجزاء میں باوجود ہزاروں انقلابات زمان و مکان کے جو ترتیب اور تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایسی ذات کے پایا جا سکے جو سب سے اوّل صاحب علم و ارادہ و با اختیار ہو۔"

"فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد للّٰہ رب العالمین ۝

الحاصل نظام ہستی کا ایک خود بخود ہستی پر ختم ہونا، اس کا ہمیشہ ہمیشہ سے ہونا، ایک ہونا، اس کا ہر قسم کے اعلیٰ کمالات اور برتر گرامی صفات سے موصوف ہونا اس کا ہر قسم کے اعلیٰ کمالات اور برتر گرامی صفات سے موصوف ہونا ثابت ہو چکا کہ حق سبحانہ و تعالےٰ کے متعلق پیغمبروں کے یہ ایسے ذاتی تجربے اور مشاہدے ہیں کہ عقل انسانی اس کے سوا کسی اور چیز کو مان بھی نہیں سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ چند ماؤف العقل پیشہ ور فلسفیوں کے سوا فطرت بشری قریب قریب ہر زمانہ میں اور ہر ملک میں ایمان کے اس جز کے ساتھ متفق ہو رہی ہے پروفیسر میکسمولر نے دنیا کے قدیم آثار و شواہد کے مطالعہ اور جستجو کے بعد اسی بنیاد پر اپنے اس تاریخی فیصلہ کا اعلان کیا ہے کہ :۔

Marfat.com

"ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے خدا کو اُس وقت جانا جس
وقت وہ اس کا شاید نام بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔"

خدا کے متعلق ایک اور سوال

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق اصلی بحث اسی نقطہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن وسواسی انسان اسی پر بس کرنا نہیں چاہتا وہ خدا کے متعلق کچھ اور سوالات بھی رکھتا ہے:۔

دنیا کے عام مذاہب نے غالباً غیر ضروری سمجھ کر ان سوالات کو شاید نہیں چھیڑا۔ یا چھیڑا بھی تو اس کے مختلف پہلوؤں کو اتنا روشن نہیں کیا گیا جس کے وہ مستحق تھے نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مختلف زمانوں میں بجائے وحی و نبوت کے عقل و حواس ہی کی اُس روشنی میں ان سوالات کو حل کرنا چاہا جو ہمیشہ "عالم غیب" میں جا کر گل ہو جاتی ہے نظیروں اور مثالوں کی غلط رہنمائی نے مختلف غلطیوں کے خندقوں میں لوگوں کو گرا دیا، مگر قرآن جو غیبی حقائق کی تشریح کی آخری روشنی ہے اُس نے وضاحت کے ساتھ اُن سوالات کو اٹھایا اور وہ جوابات دیے ہیں جنہیں فطرت و عقل بے چینی کے ساتھ ڈھونڈھتی تھی، اس سلسلہ میں جو کچھ کہا جائے گا ممکن ہے کہ ڈھونڈنے سے دوسرے مذاہب کی الہامی یادداشتوں میں بھی اس کے متعلق کچھ تسلّی مل سکے۔ لیکن جہاں تک میری جستجو کا تعلق ہے قرآن کریم کا بیان اس باب میں جتنا روشن ہے یقیناً یہ روشنی کسی دوسری جگہ میسّر نہیں آسکتی۔

Marfat.com

خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا — ؟

پہلا سوال یہی ہے، مطلب یہ ہے کہ وجود کے سرچشمہ سے ہر لحظہ اور ہر لمحہ جو گوناگوں موجیں علویات و سفلیات، جمادات و نباتات، حیوانات و انسان وغیرہ کی شکل میں پیدا ہوتی ہیں اور ہو رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی آخر ان کی پیدائش کی نوعیت کیا ہے؟ اسی سوال کی اجمالی تعبیر یہ ہے کہ

"خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟"

تقریبًا یہ سوال ہر اس دل میں پیدا ہوتا ہے جو اس عالم کی انتہا خدائے قدوس پر ختم کرتا ہے، بلاشبہ یہ ایک فطری سوال تھا لیکن اسی کے ساتھ کیا یہ بھی غیر فطری راہ نہیں تھی کہ بجائے وحی و نبوت کے اس سوال کا جواب عقل و حواس سے طلب کیا جائے انسان نے ظلم کیا کہ اپنے محدود معلومات و مشاہدات کو سامنے رکھ کر اس کا جواب دینا چاہا اس کے بعد غلط جوابوں کا جو طلسم قائم ہوا وہ عجیب و غریب تھا، اور یہی وہ طلسم ہے جس کی تعبیر مذہبی دنیا میں "مسئلہ وحدۃ الوجود" سے کی جاتی ہے[1]

---

[1] تعبیروں کی غلطی ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک قابلِ احترام (بقیہ صفحہ ۹۱ پر)

Marfat.com

(بقیہ صفحہ گزشتہ) سنجیدہ گروہ میں وحدت الوجود کا لفظ قریب ہونے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ابن خلدون جیسے انصاف پسند عالم نے اپنے مشہور علمی مقدمہ میں "وحدت الوجود" کی تشریح میں جو الفاظ نقل کیے ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ کائنات کی ان گوناگونیوں کو صوفیہ صرف نظر کا دھوکا اور انسانی احساس کا ایک غیر واقعی تاثر قرار دیتے ہیں اس نے لکھا ہے کہ دنیا سے اگر انسان اور اس کے احساسات غائب ہو جائیں تو وحدۃ الوجود والوں کے نزدیک عالم کا یہ نظام بھی باقی نہ رہے گا۔ لکھا ہے کہ "خواب میں خواب دیکھنے والوں کو سب کچھ نظر آتا ہے۔ لیکن واقع میں کچھ نہیں ہوتا۔" وحدۃ الوجود والوں کے نزدیک یہی حال بیداری کا بھی ہے اس کے الفاظ ہیں "یعتبرون ذالك بحال المنام فاذا انام وفقد الحسر وفقد کل محسوس۔" جب گھر والوں کی بدگمانیوں کا یہ حال ہو تو غیروں کا کیا گلہ کیجیے آئندہ معلوم ہو گا کہ غلط فہمیوں کے سوا یہ اور کچھ نہیں ہے۔ ۱۲

Marfat.com

مسئلہ وحدۃ الوجود کی حقیقت

وحدۃ الوجود کی ایک عام فہم مگر غیر صحیح توجیہ

وحدۃ الوجود کے ایک توسید ھے سادہ معنی یہ ہیں کہ نظامِ ہستی کی بنیاد دو وجودوں مثلاً یزداں و اہرمن یا خدا اور مادہ پر نہیں بلکہ صرف ایک خدا پر قائم ہے سب چیزیں اسی سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی پر ختم ہوتی ہیں ظاہر ہے کہ وحدۃ الوجود کا اگر یہی مطلب ہے تو خدا کے ماننے والوں میں ایسا کون ہے جو اس کا انکار کر سکتا ہے[1] لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ لوگ جواب کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس جواب سے وہ کس سوال کو حل کرنا

---

[1] بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ وحدۃ الوجود کے یہ وہ معنی ہیں جس کے اقرار پر وہ بھی مجبور ہوئے ہیں جنھوں نے عالم کا سرچشمہ بجائے خدائے حی وقیوم کے مادہ کو ٹھہرایا ہے۔ آخر مادہ پرستوں کا خیال اس کے سوا اور کیا ہے کہ عالم میں جو کچھ ہے صرف ایک ہی ہستی اور ایک ہی وجود یعنی مادہ ہی کی یہ نیرنگیاں ہیں بھلا اس سے بھی زیادہ کوئی بدیہی مسئلہ الٰہیات کا ہو سکتا ہے جس کے ماننے پر مادہ پرستوں کے دل و دماغ بھی مجبور ہیں۔

Marfat.com

چاہتے ہیں، پس جیسا کہ میں نے عرض کیا مسئلہ وحدۃ الوجود اس سوال کا جواب نہیں ہے کہ "عالم ایک وجود سے پیدا ہوا ہے یا دو سے"؟ بلکہ یہ مسئلہ دراصل اسی سوال کا جواب ہے جسے میں نے عنوان میں درج کیا ہے کہ "یعنی خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا"؟

قبل اس کے کہ اس باب میں قرآنی تشریح کو پیش کروں، ان غلط تاویلوں کا پیش کرنا مناسب ہے جن کی وجہ سے عموماً اس مسئلہ کی جانب سے لوگوں میں غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ سوال کے متعلق تو معلوم ہو چکا۔ وہ صرف اس قدر ہے کہ خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟ ظاہر ہے کہ انسان اور انسان کے علمی ذرائع، عقل و حواس، نہ اُس وقت موجود تھے جس وقت کائنات کی بنیاد پڑی نہ اس وقت عالم کے اس سرچشمہ تک ان کی رسائی ہے جہاں سے نت نئی ہستیاں مختلف صفات و کمالات کو لے لے کر برآمد ہو رہی ہیں اب جو صرف عقل و حواس کے ذریعہ اس سوال کو حل کرنا چاہے گا تو اس کے لیے بجز اس کے اور کیا چارہ کار ہے کہ اپنے محدود معلومات کو سامنے رکھ کر مختلف لوگوں نے جوابات دیے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں:۔

بعض غلط تشریحیں اور تشبیہیں

بعضوں نے کہا کہ (معاذ اللہ) خدا کی مثال ایک انڈے کی سی تھی اور جس طرح انڈا پھٹ کر مرغی بن جاتا ہے اس طرح خدا بھی پھٹ کر عالم بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کے فلسفہ ویدانت کی تعبیر ہے وید کی ایک مشہور عبارت سے اس کی تائید پیش کی جاتی ہے "یجروید" میں لکھا ہے کہ:۔

"اس پرماتما کی نابھی (ناف) سے درمیانی عالم، سر سے بالائی عالم، پاؤں

Marfat.com

سے زمین اور کانوں سے سمت بن گئے اسی طرح وہ سب لوگوں کو پیدا کرتا ہے۔"

(یجروید ادھیائے نمبر ۲۱)

یہ اور اسی قسم کی اور بھی تشبیہیں ہیں جو عوام الناس میں مشہور ہیں مثلاً خدا اور عالم کی باہمی نسبت کو کبھی دریا اور موج اور کبھی عنکبوت اور اس کے تار اور کبھی سیاہی اور حروف وغیرہ[1] سے سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے جن سے بظاہر

---

[1] مطلب یہ ہے کہ مکڑی جس طرح باہر سے نہیں بلکہ اندر سے رطوبت خارج کرتی ہے اور اسی سے اپنے اردگرد جالا تنتی ہے، یوں ہی (العیاذ باللہ) خدا نے بھی اپنے اندر سے بعض اجزا خارج کیے ان ہی سے عالم بنایا، سیاہی حروف والے کہتے ہیں کہ مختلف حروف مثلاً الف با تا ثا، اگرچہ اپنی اپنی صورتوں خصوصیتوں کے محاذ سے باہم مختلف ہیں، لیکن سیاہی سب ہی میں مشترک ہے، یوں ہی جمادات و نباتات حیوانات و انسان وغیرہ گو اپنی اپنی صورتوں اور خصوصیتوں کے لحاظ سے مختلف ہیں، لیکن خدا کا وجود ان سب میں مشترک ہے، یہی حال خدا کا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ ساری باتیں خدا اور عالم کے صحیح تعلق کو واضح نہیں کرتیں، مکڑی والی تشبیہ میں لازم آتا ہے کہ خدا کو مختلف اجزاء سے مرکب مانا جائے، دریا اور موج والی مثال بھی اسی لیے سمجھ میں نہیں آتی کہ دریا طول و عرض اور عمق رکھتا ہے اسی لیے تقسیم کو قبول کرتا ہے اور اسی لیے اس کے جس جزو میں ایک موج بنتی ہے وہ اس جزو سے مختلف ہوتا ہے جس پہ دوسری موج کی ہیئت قائم

(باقی صفحہ پیوستہ پہ)

Marfat.com

یہ خیال گزرتا ہے کہ ان تشبیہوں والے فلسفہ، ویدانت کی اتباع میں گویا اس کے قائل ہوگئے ہیں کہ خدا یا اس کا کوئی حصہ عالم بن گیا ہے۔ حالانکہ عیاذاً باللہ اگر ایسا واقعہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ خدائے کامل وقادر حیّی وقیوم آخر کیا ہوا کہ وہ خود بیٹھے بٹھائے بغیر کسی مجبوری کے ناقص ومجبور اور معذور بن گیا، دکھ درد، گندگی وناپاکی اور ہر قسم کے عیوب میں لتھڑ گیا، جو کامل تھا ناقص ہوگیا، جو زندہ تھا مردہ بن گیا پاک تھا ناپاک ہوگیا؟ کیونکہ عالم اور اس کے اجزاء کا تقریباً یہی حال ہے۔

معاذ اللہ خدا غائب

بلکہ اگر زیادہ غور کیا جائے تو گویا اس صورت میں یہ بھی لازم آتا ہے کہ جب تک عالم نہ تھا اس وقت تک تو خدا موجود تھا لیکن جب عالم پیدا ہوگیا تو خدا غائب ہوگیا، آخر مرغی یا درخت کے پیدا ہونے کے بعد کیا انڈا یا تخم باقی رہتا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ جس مذہب کا خدا ہی معدوم ہوگیا وہ مذہب مذہب اور دھرم کہلانے کا مستحق کس طرح ہو

(بقیہ صفحہ گزشتہ) ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا سیاہی کو حروف میں مشترک قرار دینا بھی مغالطہ ہے، سیاہی کے مختلف اجزاء اور قطرات سے مختلف حروف بنتے ہیں اسی لیے جس قطرے سے مثلاً الف بنتا ہے وہ اس قطرہ سے مختلف ہوتا ہے جس سے با تا وغیرہ حروف لکھے جاتے ہیں، یوں ہی اعداد اکائیوں کے مجموعہ کا نام ضرور ہے لیکن دو میں اگر دو اکائی ہوتی ہیں، تو تین میں تین، پھر کیا عالم میں بھی ہر ہستی کے ساتھ خدا کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا؟ دراصل یہ ناقص تشبیہات ہیں جن سے لوگ مغالطہ میں مبتلا ہوئے۔ ۱۲

Marfat.com

سکتا ہے؟ نہ معلوم ایسے مذاہب ہیں کس کی پوجا کی جاتی ہے اور کس کے احکام و قوانین کی پابندی کو فرض ٹھہرایا جاتا ہے۔

خدا کے ایک امر انتزاعی ، یعنی صرف مخلوق ذہنی ہونے کا نظریہ

اسی سلسلہ میں بعضوں کا بیان ہے کہ خدا ایک وجود کلّی ہے اور عالم اس کی جزئیات و تفصیلات کا نام ہے اس کو یوں سمجھایا جاتا ہے کہ مثلاً انسان ایک کلّی یا حقیقت مطلقہ ہے، جس طرح اس کا تحقق یعنی پایا جانا زید و عمرو وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے اس طرح خدا بھی عالم کے مختلف افراد کی شکل میں رونما ہوا، لیکن اگر غور کیا جائے تو اس تشبیہ کے لحاظ سے خدا کوئی واقعی ہستی باقی نہیں رہتا بلکہ جس طرح مختلف افراد زید و عمر کے اشتراکی اوصاف کو پیش نظر رکھ کر ایک مفہوم مشترک ان سب سے پیدا کر لیا جاتا ہے جس کا وجود بجز ذہن کے اور کہیں نہیں ہوتا، گویا خدا بھی اسی طرح ہمارے ذہن کا ایک خود تراشیدہ مفہوم ہے، ظاہر ہے کہ اس بنیاد پہ خدا خالق نہیں بلکہ ہمارے ذہن کی ایک خود تراشیدہ مخلوق بن جاتا ہے۔

معمار کمہار وغیرہ کی تمثیل آریائی نظریہ اور اس کی لغویت

اس سوال کے حل کی ایک راہ وہ ہے جو گزشتہ مثالوں میں دکھائی گئی اس کے مقابلہ میں ایک دوسری جماعت ہے جو اس مسئلہ کا جواب اس مثال سے دینا چاہتی ہے کہ جس طرح صانع مصنوعات کو بناتا ہے، مثلاً معمار مکان، یا کمہار برتن بناتا ہے۔ گویا اسی طرح خدا نے عالم کو بنایا ہے۔ عوام کے ذہن میں عالم اور خدا کی باہمی نسبت کے متعلق کچھ اسی قسم کا خیال ہے اس پہ

Marfat.com

کھلا ہوا سوال ہوتا ہے کہ صانع مصنوع کو بغیر مادہ کے پیدا نہیں کر سکتا، کمہار بغیر مٹی کے، نجار بغیر لکڑی کے کیا اپنی صنعتی قوت کا اظہار کر سکتا ہے؟ اور جب خدا اسی طرح کا صانع ہے تو اُس نے بغیر مادّہ کے کس طرح عالم کو بنایا؟

ہندو فلاسفروں کی ایک جماعت نے اسی بنیاد پر یہ مان لیا کہ ابتداء میں صرف خدا نہ تھا بلکہ خدا کی طرح مادہ بھی خود بخود موجود تھا، اسی مادہ سے خدا نے عالم کو پیدا کیا۔ آریہ کے نام سے اس زمانہ میں ہندوؤں میں جو ایک نیا فرقہ پیدا ہوا ہے اُس نے قدیم ہندی فلسفہ کے اسی مکتب خیال کو اپنا مذہبی عقیدہ قرار دیا ہے۔

لیکن یہ خیال اتنا مہمل ہے کہ فلسفہ اور مذہب کی کسی جماعت میں کبھی اس خیال نے اعتماد پیدا نہیں کیا، فلسفہ والے تو یہ کہتے ہیں کہ جب ابتداء میں مادہ کو مان لیا گیا تو اب عالم کی پیدائش کے لیے خدا کا وجود فالتو ہو جاتا ہے، اس لیے یورپ کے مادّیین صرف اسی کے قائل ہو گئے۔ اور مذاہب چونکہ توحید کے حامی ہیں اس لیے ان کے لیے مشکل ہے کہ مادّہ کو خدا کی مخلوقیت سے نکالیں، کیونکہ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب مادہ ہی خدا کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے تو مادہ کی مختلف صورتیں جن کا نام عالم ہے اُس کو خدائی مخلوق کہنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

پھر قطع نظر اس کے اگر عالم اور خدا میں وہ نسبت مان لی جائے جو صانع اور مصنوع میں ہے تو یہ ایک مشاہدہ ہے کہ صانع یعنی معمار کے مرجانے کے بعد مصنوع یعنی مکان معدوم نہیں ہوتا یعنی مصنوعات کے موجود اور پیدا ہو جانے کے بعد صانع کا وجود بے ضرورت ہو جاتا ہے پس اس نظریہ کی بنیاد پر

Marfat.com

کہ عالم کو خدا نے اس طرح پیدا کیا جیسے معمار مکان بناتا ہے یہ لازم آتا ہے کہ پیدائش عالم کے لیے ممکن ہے کہ ابتدا میں دنیا کو خدا کی ضرورت ہو لیکن اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی، حالانکہ تمام مذاہب، عالم کو ہر نوع خدا کا محتاج ہر حال اور زمانہ میں قرار دیتے ہیں۔

اسلامی وحدۃ الوجود یا مسئلہ قیومیت

وہی سوال کہ خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا؟ اس کے وہ جوابات تو تم سن چکے، جو غیر اسلامی دائروں سے دیے گئے اب آؤ اور دیکھو کہ قرآن اس کا کیا جواب دیتا ہے، قبل اس کے کہ میں قرآنی تصریحات کو پیش کروں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسئلہ کے اندر پیچیدگی کیوں پیدا ہوگئی؟ بات یہ ہے کہ انسان میں جہاں اور بہت سی فطری خصوصیات ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ بغیر نظیر اور مثال کے کسی چیز کے ماننے میں اسے سخت دشواری پیش آتی ہے، یوں ماننے کے لیے کہا جائے تو جبراً قہراً آدمی سب ہی کچھ مان سکتا ہے اور مان لیتا ہے، لیکن اطمینان وتشفی کے لیے وہ نمونہ اور مثال ونظیر کا بالکلیہ محتاج ہے، اسی مسئلہ میں دیکھیے واقعہ تو یہی ہے کہ مسلمان ہو یا ہندو عیسائی ہو یا یہودی الغرض کسی مذہب کا آدمی ہو، نہ تو کوئی پیدائش عالم کے بعد خدا کو معدوم سمجھتا ہے، نہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ گندگیوں نجاستوں اور عیوب ونقائص میں مبتلا ہوگیا ہے حتیٰ کہ آریوں کے سوا کوئی سچا ہندو بھی یہ نہیں مانتا کہ مادہ عالم کا خالق خدا نہیں ہے، بلکہ سب کے سب کائنات کی تمام کثرتوں کو ایک ہستی واحد پہ ختم کرتے ہیں، دنیا کے تمام مذاہب کا اس پہ اتفاق ہے۔ لیکن بایں ہمہ جب آفرینش عالم کی کیفیت کے

Marfat.com

متعلق سوال اُٹھا تو انھوں نے غلط مثالوں اور تعبیروں کے ذریعہ سے اس کو حل کرنا چاہا جن سے اُن پہ ایسے الزامات قائم ہوگئے جن کے خود قائل نہیں ہیں، ابھی "یجر وید" کی عبارت گزری جس میں بظاہر خدا کو تخم فرض کر کے عالم کے درخت کو اُس سے اگایا گیا ہے اُس کے بعد لازم آتا تھا کہ پیدائشِ عالم کے بعد خدا غائب ہوگیا، لیکن یجر وید کے اسی فقرے کے آخر میں "اسی طرح وہ سب کو پیدا کرتا رہتا ہے۔" اس کا اضافہ کر کے صاف صاف ظاہر کر دیا گیا کہ خدا عالم کو پیدا کرنے کے بعد بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح اس سے پیشتر تھا۔

قرآن کا خاص طریقہ لیکن قرآن نے اس قسم کے مسائل میں رہنمائی بخشنے کے لیے ایک کلیۃ ہمارے لیے پیش کر دیا ہے مشہور صوفی شاعر مغربی نے اسی کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:۔

چو نبست چشم دولت تا جمال او بینی ۔۔۔ نگہ بصورت خود تا مثال او بینی

ان کا اشارہ قرآن کی اس حقیقت کی طرف ہے کہ "خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ اور نمائندہ قرار دیا ہے۔" میرے نزدیک "حدیث شریف" میں اسی کی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ "**خلق اللہ آدم علیٰ صورتہ**" مطلب یہ ہے کہ خدا کے افعال و

لہ "پیدا کیا اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر" واضح رہے کہ یہاں صورت سے مراد وہی ہے جو میں نے متن میں عرض کیا ہے کہ انسان اس عالم میں خدا کے افعال و صفات کا ایک نمونہ ہے نہ کہ معاذ اللہ جسمانی اور مادّی صورت کہ وہ اس سے وراء الوراء ہے، نیز حدیثوں کے سوا یہ فقرہ بائبل میں بھی پایا جاتا ہے۔ ۱۲

Marfat.com

صفات کی مثال اگر مل سکتی ہے تو باہر نہیں بلکہ آدمی کے اندر ہی کچھ مل سکتی ہے۔
مرزا بیدل نے سچ کہا ہے :-

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم ندمیدۂ در دل کشا بچمن درآ

پس یہ اہم سوال کہ خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا ؟ اس کے جواب کے لیے بھی بجائے بیرونی مثالوں اور خارجی نظیروں کے یہ مناسب ہوگا کہ ہم اپنے "تخلیقی افعال و اعمال" پہ غور کریں، عام مسلمانوں نے ایک حد تک یہی کیا بھی ہے، لیکن انھوں نے خلق (پیدا کرنا) اور صنعت (بنانا) میں فرق نہیں کیا، خدا کس طرح خلق کرتا ہے ؟ اس سوال کو انھوں نے اس مثال سے حل کرنا چاہا کہ انسان کس طرح بناتا ہے، اور گو وہ خود اس کے قائل نہیں ہیں کہ عالم اور خدا میں وہ نسبت ہے جو معمار اور مکان میں ہے، ہر مسلمان یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اس کو رکھنا چاہیے کہ جس طرح عالم اپنی پیدائش میں خدا کا محتاج ہے اسی طرح اپنی بقا میں بھی ہر وقت ہر لحظہ وہ خدا کا دستِ نگر ہے، لیکن انھوں نے جو مثال دی ہے اس سے لازم آجاتا ہے کہ عالم صرف اپنے بننے میں خدا کا محتاج ہو، بننے کے بعد اب اُسے خدا کی اسی طرح ضرورت نہ رہی جس طرح مکان کو معمار کی نہیں رہتی ہے۔

اپنے خیالی عمل تخلیق فی الذہن پہ غور کرو

پس اصل یہ ہے کہ اگر کوئی اس سوال کو حل کرنا چاہتا ہے تو اس پہ غور کرنا چاہیے کہ انسان اپنی "مخلوقات" کو کس طرح پیدا کرتا ہے ؟ شاید لوگوں کو تعجب ہو کہ کیا انسان بھی کوئی چیز پیدا کرتا ہے یا کر سکتا ہے ؟ آپ کو یاد ہوگا

Marfat.com

ان دروس کے ابتدا میں میں نے ہی آپ کو بتایا تھا کہ "انسان صرف جان سکتا ہے، کسی چیز کے پیدا کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں ہے" مگر سچ یہ ہے کہ انسان کے تمام اندرونی اور بیرونی افعال پہ ابھی غور نہیں کیا گیا، یہ درست ہے کہ باہر کی چیزوں کے حساب سے انسان اُن پہ صرف صنعتی عمل ہی کر سکتا ہے، قوانین فطرت کو جان کر ان کی صلاحیتوں کو کھول سکتا ہے مثلاً وہ پتھر پیدا تو نہیں کر سکتا لیکن پتھر میں مورت یا صورت بننے کی جو صلاحیت ہے اُسے پتھر اور لوہے کے قوانین جاننے کے بعد ظاہر کر سکتا ہے۔

یہ تو باہر کا حال ہے (اور اسی لحاظ سے میں نے پہلے وہ بات کہی تھی) مگر اب اس کے اندرونی افعال پہ غور کرو، انسان جب عالمِ خیال میں عمل کرتا ہے اُس وقت سوچو کہ وہ کیا کرتا ہے؟ دیکھو، نہ اینٹ ہوتی ہے نہ چونا، نہ پتھر ہوتے ہیں نہ اور کچھ لیکن آدمی چاہتا ہے کہ میں مثلاً چار مینار[1] کو ذہن کی دنیا میں پیدا کر دوں، ارادہ کرتا ہے اور چار مینار کو اپنے سامنے کھڑا پاتا ہے، اور اسی طرح اپنے علم میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی ہر قسم کی چیزوں کو

---

[1] یہ حیدر آباد کی ایک مشہور تاریخی عمارت کا نام ہے اس کی تاریخیت ہی کا یہ اثر ہے کہ سلطنت آصفیہ کے طلائی و نقرئی سکوں پہ اسی عمارت کی تصویر طبع ہوتی ہے طلبا د جامعہ عثمانیہ قدرتاً اس عمارت سے مانوس ہیں۔ اس لیے درس میں تفہیم کے لیے اسی عمارت کا انتخاب کیا گیا عام ناظرین بجائے چار مینار کے کسی اور عمارت یا چیز کو فرض کر سکتے ہیں۔ لا مشاحۃ فی الامثال - ۱۲ منہ

Marfat.com

پیدا کرتا ہے۔

کیا دماغوں میں تصویروں کے چھپنے کا سلسلہ جاری ہے

احمقوں کا گروہ ہے جو خیال کرتا ہے کہ دیکھنے کے بعد مثلاً چار مینار کا عکس ہمارے دماغ میں چھپ جاتا ہے اور جب ہم التفات کرتے ہیں تو وہی عکس ہمارے سامنے آجاتا ہے لیکن کاش وہ سوچتا کہ اگر چار مینار کا عکس ہمارے دماغ میں اُترتا ہے تو انسانی بھیجے کی تشریح وتحلیل سے یہ عکس اس سے کیوں برآمد نہیں ہوتا، اگر واقعی دماغ میں تصویروں کے چھپنے کا سلسلہ جاری ہے تو ایک کھوپڑی کے توڑنے کے بعد یہ چاہیے کہ تصویروں کا ایک انبار ہمارے دماغوں سے اُبل پڑے، حالانکہ یہ مشاہدہ کے خلاف ہے اور یہی نہیں انطباع کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ ایک پلیٹ یا ایک چیز پر جب کسی چیز کی تصویر چھپ چکتی ہے تو پھر اسی پلیٹ پر دوسری تصویر اگر چھپے گی تو دونوں تصویروں کے باہمی اختلاط سے دونوں ہی کی اصل حقیقت بگڑ جائے گی، حالانکہ عالم خیال (یا علمی عالم) میں ہر ایک چیز دوسری سے ممتاز اور اپنی اصلی حالت میں محسوس ہی کی جاتی ہے، یہ عجیب لوگ ہیں اتنا بھی خیال نہیں کرتے کہ ہم قوۃ تخیل سے جب چار مینار کو اپنے ذہن میں پیدا کرتے ہیں تو وہ اپنی وسعت کے لحاظ سے سینکڑوں گز کی لمبی چوڑی عمارت ہوتی ہے پھر کیا چند انچ کے دماغ میں اتنی لمبی چوڑی وسیع وکشادہ عمارت سما سکتی ہے۔

پس واقعہ یہ ہے کہ چیزوں کے چھپنے اور انطباع کا قانون قطعاً ایک بازاری اور عامیانہ خیال ہے، بلکہ صحیح بات وہی ہے جیسا کہ فلاسفۂ اسلام[1] اور صوفیہ[1] کا

---

[1] شیخ اکبر اپنی کتاب فصوص الحکم میں فرماتے ہیں۔ بالوھم یخلق (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

نظریہ ہے کہ انسان کو جب کسی چیز کا علم حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے تو اس علمی اثر کے بعد انسان میں اُس کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنی معلوم کی ہوئی شے کو اپنی خیالی قوت سے پیدا کرے، اور یہی انسان کا "تخلیقی عمل" ہے تفہیم کے لیے ہم اپنی اصطلاع میں اس تخلیقی قوت کا ایک نام "کن فیکونی قوت" رکھتے ہیں ولا مشاحنۃ فی الاصطلاح۔ قرآن کا بیان ہے کہ اس کن فیکونی قوت سے خدا بھی اپنی مخلوقات کو پیدا کرتا ہے ارشاد ہے :-

"اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْن"

(اس کا کام یہ ہے کہ جب کسی چیز کے متعلق ارادہ کیا تو اس سے کہتا ہے کہ ہوجا پس وہ ہو جاتی ہے)

اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے خیالی اور علمی یا "کن فیکونی مخلوقات" سے جس قسم کے تعلقات انسان کے ہوتے ہیں قرآن پاک نے ان سارے روابط کو خدا اور عالم کے درمیان ثابت کیا ہے، میں ان تعلقات اور نسبتوں میں سے بعضوں کو یہاں درج کرتا ہوں۔

(۱) پہلا تعلق۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ حق تعالےٰ نے عالم کو بغیر مادہ کے پیدا کیا ہے جیسا کہ "بدیع السّماوات والارض" کے قرآنی الفاظ کا اقتضاء۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کل انسان فی قوۃ خیالہ مالا وجود لہ الا فیہا وھذا ھو الامر العام[۲۹] فتوحات مکیہ "اسفار اربعہ" وغیرہ میں اس مسئلہ کی تفصیلات پڑھیے۔ ۱۲ منہ

Marfat.com

یہ ہے ۔اسی کی تفسیر حدیث میں ہے کہ " کان اللہ ولم یکن معہ شئ " جس کے معنی یہی ہیں کہ آسمان و زمین کچھ نہ تھے اور پھر پیدا ہو گئے ۔

حاصل یہ ہے کہ ابتداء میں خدا کے سوا کچھ نہ تھا یعنی مادہ وغیرہ کچھ نہیں تھا اور پھر خدا نے قوۃ کن سے اس عالم کو پیدا کیا ، ٹھیک جس طرح ہمارے خیال یا (علم) میں کچھ نہیں ہوتا ہے پھر محض اپنے ارادہ کن سے اپنی معلومات کو ہم وجود عطا کرتے ہیں ، پس اگر خدا نے بھی ایسا ہی کیا تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے ؟

(۲) اسی طرح قرآن کا بیان ہے کہ :۔

" وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ "

(یعنی موجودہ نظام عالم کی بربادی کے لیے (یا قیام قیامت کے لیے) پلک جھپکانے بلکہ اس سے بھی کم زمانہ کی ضرورت ہے")

ہم بھی جب اپنے خیالی اور علمی مخلوق مثلاً اسی چار مینار کو جسے خیال میں پیدا کرتے ہیں اگر برباد کرنا چاہیں تو اس کے لیے لمح بصر (پلک جھپکانے) سے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں ، صرف توجہ کا ہٹا لینا کافی ہے ، توجہ ہٹا لینے کے ساتھ ہی ہمارے خیالی مخلوقات معدوم ہو جاتے ہیں اور بغیر کسی مادہ چھوڑنے کے معدوم ہو جاتے ہیں ۔"

(۳) ہماری خیالی اور علمی مخلوق مثلاً چار مینار جس طرح پیدا ہونے میں ہمارے ارادہ اور توجہ کی محتاج ہے ٹھیک اسی طرح ہر لحظہ اور ہر لمحہ اپنے قیام و بقا میں بھی ہماری توجہ اور التفات کی وہ دست نگر ہے ۔ یہی قرآن کا بھی بیان ہے کہ خدائے تعالےٰ عالم کا صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ قیوم بھی ہے یعنی وہی اسے تھامے

Marfat.com

ہوئے ہے (یعنی عالم اسی سے قائم ہے)

اگر ادنیٰ التفات اس کی طرف سے ہٹالے تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ہے :۔

"اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ"

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے (یعنی مُردہ مادّہ نہیں ہے)

قیوم ہے (یعنی عالم کو تھامے ہوئے ہے، ایسا خالق نہیں ہے جیسا کہ معمار مکان کا یا صانع مصنوع کا بلکہ وہ خالق قیوم ہے) اُسے نہ غنودگی پکڑتی ہے اور نہ نیند چھوتی ہے (کیونکہ اگر ایسا ہو تو نظام عالم قائم نہیں رہ سکتا)

خیال میں کسی مخلوق کو پیدا کرکے اگر کوئی اونگھ جائے یا سو جائے تو اس کی یہ پیدا کی ہوئی مخلوق کیا باقی رہ سکتی ہے؟

(۴) اب اس پر غور کیجیے کہ مثلاً زید اپنی "کن فیکونی قوت" سے عالم خیال میں جس وقت چار مینار کو پیدا کرتا ہے کیا زید چار مینار ہو جاتا ہے، چار مینار زید بن جاتا ہے؟ ہم بالبداہتہ جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔[1] لیکن اسی کے ساتھ اس کو سوچیے کہ اس خیالی اور علمی چار مینار کا وجود

---

[1] آخر غور کرنا چاہیے کہ اپنے ذہن میں جو کوئی مثلاً گدھے کا تصور کرتا ہے کیا اس وقت وہ گدھا بن جاتا ہے۔ یا گدھا وہ ہو جاتا ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ پس خالق قیوم کے متعلق بھی یہ باور کرنا کہ قیومی نسبت کی وجہ سے وہی عالم ہے اور عالم وہی ہے اپنی ہی حماقت ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علواکبیرا۱۲

Marfat.com

زید کے وجود اور ارادہ سے کیا جدا ہے؟ اس کے ہونے کے معنی بجز اس کے اور کیا ہیں کہ اُس کا ارادہ اور اس کی توجہ اس کی طرف ہے، یہ نہ ہو تو چار مینار کی نہ دیواریں ہوں نہ محراب اور نہ مینار — تو اسی طرح سمجھیے کہ نہ عالم خدا بن گیا ہے نہ خدا عالم بن گیا ہے لیکن عالم کا وجود بجز اللہ کے وجود و ارادہ کے کچھ نہیں۔

(۵) اس پر بھی غور کیجیے کہ آپ جس وقت اپنی خیالی مخلوق کو ذہن میں پیدا کرتے ہیں کیا اپنے آپ کو اس خیالی مخلوق کے کسی فوقانی، تحتانی ظاہری و باطنی حصّہ سے غائب پاتے ہیں؟ غور کیجیے کہ آپ جس طرح اپنے کو اس کی دیواروں کی جڑ کے پاس پاتے ہیں اسی طرح اس کے میناروں پر بھی یقیناً پائیں گے، آپ کو جو نسبت اس کے ظاہر سے ہے اُس کے باطن سے بھی وہی نسبت آپ کو ہوگی، قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ خالق قیوم، عالم کے اوّل میں بھی ہے اور آخر میں بھی، ظاہر میں بھی ہے، باطن میں بھی۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ"

(وہی اوّل ہے اوہی آخر ہے، وہی ظاہر ہے اوہی باطن ہے اور وہی ہر چیز کا جاننے والا ہے)

کہیں فرمایا جاتا ہے کہ خدا عرش پر ہے، کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ انسان کی رگِ گردن کے پاس بھی ہے، خود ہی غور کیجیے ایک خالق اور اُس کی مخلوق میں اس کے سوا اور نسبت ہی کیا ہوتی ہے؟ آخر آپ بھی تو اپنے آپ کو اپنے خیالی چار مینار کے

Marfat.com

کنگروں پہ بھی پاتے ہیں اور اس کی دیوار کی جڑوں کے پاس بھی، پھر اگر اس عالم کا خالق اگر عرش پہ بھی ہو اور آپ کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہو، تو اس کے سوا اور عقل سوچ ہی کیا سکتی ہے۔

(۶) اب دیکھیے چار مینار ایک طویل و عریض عمارت ہے آپ اپنے ذہن میں جس وقت اُسے پیدا کرتے ہیں اس کے طول و عرض کے ساتھ پیدا کرتے ہیں۔ اس لمبائی اور چوڑائی کے باوجود آپ اپنے کو کیا اس کے ذرّہ ذرہ پہ محیط نہیں پاتے لیکن کیا اگر اس ذہنی چار مینار کو آپ دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے تو اس کی تقسیم کی وجہ سے آپ کے بھی دو حصے ہو جاتے ہیں؟ قطعاً نہیں، قرآن بھی یہی کہتا ہے :-

" واللہ بکل شئٍ محیط " (اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہیں)

لیکن اس احاطہ کی وجہ سے خدا کی ذات میں کوئی تقسیم اور تجزی نہیں ہوتی -

(۷) اسی طرح آپ اپنے ذہنی و علمی چار مینار کے کسی مینار کو توڑ دیجیے یا اس کے کسی حصہ میں کوئی گندگی، نجاست وغیرہ مثلاً فرض کیجیے، پھر کیا اس شکست و ریخت اور اس گندگی و نجاست کا اثر آپ پہ بھی مرتب ہوتا ہے؟ یقیناً نہیں، پھر اگر قرآن خدا کو عالم کی ہر چیز کے ساتھ ہر جگہ مانتا ہے لیکن باوجود اس کے عالم کے کسی تغیّر، کسی عیب و نقص کا اثر خدا کی ذات پہ نہیں پڑتا تو کیا "کن فیکونی مخلوقات" کے ساتھ خالق کے تعلقات کی یہی نوعیت نہیں ہوتی؟

(۸) آپ جس وقت اپنے ذہن میں کسی پہاڑ یا کسی شہر کو پیدا کرتے ہیں کیا اُس

Marfat.com

ذہنی خیالی یا علمی مخلوق میں کسی دوسرے کے ارادہ سے کوئی چیز اپنی جگہ سے ہل سک
ہے غور کیجیے اس کا ہر ذرّہ آپ ہی کی مرضی اور آپ ہی کے ارادہ کا پابند
دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

پس مذہب بھی اگر یہی کہتا ہے کہ :-

"ان یمسسک اللّٰہ بضرٍ فلا کاشف لہٗ الّا ھو وان یردک بخیر
فلا رادّ بفضلہٖ۔"

(اگر چھوئے اللہ تجھے کسی ضرر کے ساتھ پھر اُسے کوئی کھولنے والا نہیں لیک
وہی، اور وہ اگر ارادہ کرے تیرے ساتھ بھلائی کا کوئی اس کی مہربانی
پلٹانے والا نہیں ہے")

یعنی اس عالم کے کسی حصّہ میں کوئی واقعہ بھی بغیر ارادہ اذن حق کے نہیں
ہو سکتا اور کسی دوسرے کا تصوّر یا ارادہ یا فعل اُس میں قطعًا موثر نہیں
ہو سکتا۔

تو کیا عقل اس کے سوا کچھ اور بھی سوچ سکتی ہے ؟

(۹) آپ جب خیالی چار مینار کو پیدا کرتے ہیں تو جہاں آپ ہوتے ہیں کیا چ
مینار بھی وہیں نہیں ہوتا، جب ایسا ہے تو خدا نے جب عالم کو پیدا کیا
اور خدا اس کا خالق اور وہ اس کا مخلوق ہے تو اُس کے بعد یہ سوال کتن
بے معنی ہو جاتا ہے کہ عالم کہاں ہے اور خدا کہاں ہے ؟

یہ سچ ہے کہ ایک ہی نوعیت یا ایک ہی ظرف کے دو وجود یعنی
دو مخلوق یا اگر دو خالق فرض کیے جا سکتے ہوں تو ایسے دو ہم ظرف ہم مثل

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

موجودوں کی ایک ہی فضا یا ایک ہی مکان میں گنجائش ناقابل تصوّر ہے لیکن دو ہستیوں میں ایک خالق اور دوسری مخلوق ہو تو ایسی حالت میں مخلوق کے پائے جانے کے لیے خالق کا علم و ارادہ اور اس کی توجہ ہی کافی ہوتی ہے۔ جب قرآن میں فرمایا گیا کہ

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ل؎ عموماً موجودات کی تقسیم یوں کی جاتی ہے کہ اُن کا وجود انسانی ارادہ اور خیال کا اگر تابع ہے مثلاً ذہنی اور خیالی مخلوقات کا جو حال ہے ان ہی کا نام موجودات ذہنیہ رکھا جاتا ہے سمجھا جاتا ہے کہ اُن کے وجود کا ظرف انسان کا ذہن ہے لیکن انسانی ارادہ اور خیال کا تابع اگر ان کا وجود نہ ہو، بلکہ حق تعالےٰ کے تخلیقی ارادہ اور ایجادی قیومیت کے ساتھ ان کا وجود وابستہ ہو، تو ان ہی کو خارجی موجودات کے نام سے موسوم کرتے ہیں کہا جاتا ہے کہ ان کے تحقق اور یافت کا مقام وظرف خارج ہے، یعنی انسانی ذہن وخیال سے اس کا وجود خارج ہے، ان ذہنی اور خارجی موجودات کے سوا ایک وجود حق تعالےٰ کا ہے جو ظاہر ہے کہ خود بخود ہے اور حق تعالےٰ کے تخلیقی ارادہ کا تابع نہیں ہے، لیکن عام ارباب فکر اس تیسری قسم سے غافل ہو کر وجود کو صرف دو ہی قسموں خارجی و ذہنی میں منحصر سمجھتے ہیں اسی لیے خالق اور مخلوق کے وجود میں صرف نوعیت اور ظرف مقام کے لحاظ سے ان کو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ گویا دو مخلوق وجودوں میں جو تعلق ہوتا ہے سمجھتے ہیں کہ یہی تعلق خالق و مخلوق کے وجود میں بھی ہے یہی بے تمیزی لغزش اور مغالطہ کا مقام ہے۔

Marfat.com

"هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ "

تو لوگوں کو تعجب ہوا کہ جہاں ہم ہوتے ہیں، وہیں خدا کس طرح ہو سکتا ہے لیک
لوگ اپنے مخلوقات کے متعلق نہیں سوچتے کہ جہاں وہ ہوتے ہیں وہاں ان کے مخلوق
اُن سے باہر ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ اگر آدمی اپنے ذہنی مخلوقات کے متعلق غ
کرے تو کیا اپنے آپ کو اُن کے نیچے یا اوپر یا کسی اور سمت میں پاتا ہے ؟ یقیناً
خالق و مخلوق میں کوئی ایسی سمتی نسبت نہیں پیدا ہوتی پھر کیا ہوا اگر قرآن
اعلان کیا گیا کہ

"اَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ"

یعنی "جدھر تم رُخ کرو گے وہیں خدا ہے۔"
سوچنا چاہیے کہ آخر اس کے سوا اور کیا کہا جاتا ؟

الحاصل خدا نے عالم کو کس طرح پیدا کیا ؟ وہ عالم کو کس طرح محیط ہے
وہ ہر چیز کے ساتھ کس طرح ہے ؟ عالم کے ہر ذرّہ کی حرکت و سکون حق کے
ارادہ کے ساتھ کس طرح وابستہ ہے ؟ وہ اپنی مخلوقات کے ظاہر و باطن میں کس
طرح پایا جاتا ہے ؟ ان سارے سوالات کا حل بجائے باہر کے اگر آدمی سوچے
تو خود اپنے اندر پا سکتا ہے ، اور یہی مطلب ہے اس فقرہ کا کہ "عالم کا وجود
بجز وجودِ حق کے اور کچھ نہیں۔" صحیح حدیث میں۔

اِلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ

(ہاں! ہر چیز اللہ کے سوا ہیچ ہے)

کے مصرعہ کی توثیق فرمائی گئی ہے۔ لیکن بایں ہمہ نہ خدا عالم بنا ہے نہ عالم خدا بن گیا

Marfat.com

ہے ، اور آپ نے دیکھا کہ خالق و مخلوق کی باہمی نسبتوں پر غور کرنے کے بعد فطرت انسانی اس اسلامی اور قرآنی بیان کے سوا کسی اور راہ سے کیا تسلی پا سکتی ہے اسی مسئلہ کو مسئلہ قیومیت کہتے ہیں ۔ عارف جب اثر و موثر خالق و مخلوق میں ان نسبتوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو چیخ اُٹھتا ہے :-

ندیم و مطرب و ساقی ہمہ اوست　　　خیال آب و گل در رہ بہانہ

(العارف شیرازی)

یعنی آب و گل ، خدا کا خیالی یا تخلیقی عمل ہے ۔ مغربی نے اور واضح لفظوں میں تشریح کی ہے ، ان کی اسی غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے جس کے مطلع کا ذکر پہلے آ چکا ہے فرماتے ہیں :-

خیال بازی او بیں کہ پردۂ او خیالی　　　فگندہ بر رُخ خود تا خیال او بینی

مسئلہ ربوبیت

ایسا خالق قیوم اگر اپنی مخلوقات کو دفعتہً نہیں بلکہ آہستہ آہستہ پیدا کرتا ہو ، مثلاً دفعتہً درخت کو نہ پیدا کرے بلکہ تدریجی طور پر مثلاً تخم سے درخت بنائے اور درختوں میں پھل لگائے تو اب وہ علاوہ قیوم کے رب بھی ہے ۔ ایسی صورت میں مخلوق صرف باقی رہنے ہی میں خالق کی محتاج نہیں رہتی ہیں بلکہ اپنے کمال تک پہنچنے میں بھی ہر آن و ہر لحظہ مسلسل ارادہ کن اور فیض تخلیقی کی انھیں ضرورت ہوتی ہے اور اس تدریجی تخلیق کی وجہ سے اُس شے کا تخیل یا توہم ہوتا ہے جسے ہم "زمانہ" کہتے ہیں جس کے متعلق فلسفیوں کو اب تک نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کیا ہے اور کس حاسّہ کے معلومات سے اس کا تعلق ہے مسئلہ ربوبیت پر غور کرنے کے بعد اس کا سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے[۵]۔

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

معجزات وخوارق کے متعلق ایک عام غلط فہمی اور اُس کا ازالہ

اور یہی قیومی تخلیق جب ربوبیت کی شکل میں ظہور پذیر ہوتی ہے تو اس کا نام "قانون فطرت" رکھ دیا جاتا ہے، پھر چونکہ اس عالم میں عموماً تخلیق کا عام طریقہ قانون ربوبیت کے زیر اثر انجام پا رہا ہے اس لیے صرف قیومی تخلیق کے سمجھنے سے لوگ گھبراتے ہیں، مثلاً اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ لکڑی کیمیائی عمل کے بعد مٹی ہوگئی اور مٹی گیہوں اور گیہوں روٹی، پھر روٹی مرغی کا بچہ بن کر سانپ کی غذا بنی اور اس میں سانپ کا نطفہ بن کر بالآخر وہی لکڑی سانپ کی صورت میں لہرانے لگی، تو عوام الناس کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوتی لیکن اسی سلسلہ کو ربوبیت کی تدریجی منزلوں سے ہٹا کر اگر یوں کہہ دیا جائے کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاتھ کی لکڑی سانپ بن گئی، تو بازاریوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے اور "ناممکن" ہو نہیں

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

لہ زمان کا مسئلہ فلسفہ کے مہمات میں شمار کیا جاتا ہے، قدیم و جدید دونوں فلسفوں میں زمانہ اور طائم کا مسئلہ "جذر اصم" بنا ہوا ہے۔ ارسطو کا مشہور قول ہے کہ زمانہ کا شمار ان چیزوں میں ہے جو بدیہی الانیۃ اور غریق فی النظریۃ ہیں سب ہی جمعہ، جمعرات دن رات، صبح و شام اور ماہ و سال کو جانتے ہیں لیکن جس چیز کی تعبیر ان الفاظ سے کی جاتی ہے اس کا علم آدمی کو کس حاسّہ سے ہو رہا ہے؟ عجب سوال ہے ظاہر ہے کہ جمعہ کو نہ آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے نہ کانوں سے سنا جاتا ہے نہ ناک سے سونگھا جاتا ہے نہ ہاتھ سے چھوا جاتا ہے مگر باوجود اس کے سب جانتے ہیں کہ جمعہ کو ہم جان رہے ہیں ۱۲۔

Marfat.com

...کا شور افلاک تک پہنچ جاتا ہے حالانکہ ان دونوں شکلوں میں بجز ربوبیت اور قیومیت
...ے اور کوئی فرق نہیں بلکہ انسان اپنے "تخلیقی کارناموں پر" اگر غور کرے تو اسے نظر
...ئے گا کہ قیومی تخلیق ربوبی تخلیق سے بدرجہا آسان اور سہل ہے، قیومی تخلیق خالق کی
...رف معمولی توجہ اور التفات کی دست نگر ہے، بخلاف ربوبی تخلیق کے کہ اس میں
...ل توجہ مسلسل اور غیر منقطع التفات تام کی حاجت ہے۔ حیرت ہے کہ ربوبی تخلیق
...ہم جس ذات کو بدرجۂ اتم قادر اور مقتدر دیکھ رہے ہیں جب اسی کی طرف کبھی کبھی
...یومی تخلیق کی نسبت کی جاتی ہے تو نافہم اس کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک ذیلی
...ت تھی لیکن ضروری تھی اس لیے ضمناً یہاں اس کا ذکر کر دیا گیا۔

...چند اور ذیلی سوالات

اب میں چاہتا ہوں کہ مسئلہ قیومیت و ربوبیت کو ختم کرنے سے پہلے چند اور ایسے ہی ذیلی سوالات ...بھی جو یہاں پیدا ہوتے ہیں حل کر دیا جائے۔

پہلا سوال :-

(۱) ہمارے ذہنی مخلوقات کا وجود فقط ذہنی ہوتا ہے ان کا اثر نہ ہمارے حواس ...ر پڑتا ہے نہ دوسرے اس کو محسوس کر سکتے ہیں۔ بخلاف خدائی مخلوقات کے ...ان کا مشاہدہ ہر شخص کر رہا ہے۔

جواب

مگر ظاہر ہے کہ ہماری "تخلیقی قوت" اتنی زور دار نہیں ہو سکتی یا نہیں ہے ...نی خالق عالم کی ہے، اسی لیے اگر ہمارے ذہنی مخلوقات بیرونی وجود نہ حاصل ...سکیں تو یہ ہماری تخلیقی قوت کے ضعف کا نتیجہ ہے اور یہ ضعف اس سے بھی

Marfat.com

ظاہر ہے کہ ہم عام طور پر کسی خیالی مخلوق پر چند سکنڈ سے زیادہ اپنی توجہ کو قائم نہیں رکھ
سکتے ۔ لیکن وہ جو دیر تک کسی ایک نقطہ پر توجہ کو مرتکز کرنے کی مشق بہم پہنچا لیتے
ہیں آپ کو معلوم ہوگا کہ بتدریج اُن کے ذہنی مخلوقات بھی خارجی وجود کا بھیس بد
لگنے ہیں، حتیٰ کہ دوسروں کو بھی اس کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے مثلاً عموماً مسمریز
کی جو لوگ مشق کرتے ہیں وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے خیالی تصورات کا عکس دوسر
کے حواس پر بھی ڈال دیتے ہیں اور جو ان سے بھی قوی تر ہوتے ہیں وہ کچھ دیر کے
لیے نہیں، بلکہ اُس سے زیادہ مستقل، ٹھوس اور نمایاں قسم کے کام انجام دینے
لگتے ہیں[1]
اس سلسلہ میں اس بیماری کا ذکر اس مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی پیدا کر سکتا ہے جو

---

[1] شیخ اکبر "فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں :-
"العارف يخلق بهمته ما يكون له وجود من خارج محل الهمة
ولكن لا تزال الهمة تحفظه ولا يؤده حفظه اى حفظ ما خلقته
متى هو على العارف غفلة عن حفظ ما خلق عدم ذالك المخلوق
یعنی عارف اپنی ہمت سے ایسی چیز بنا دیتا ہے جس کا وجود خارج میں ہوتا ہے یعنی
خارجی آثار اس پر مرتب ہوتے ہیں پھر عارف کی ہمت اور ارادہ اس مخلوق کی نگرا
کرتا رہتا ہے لیکن اس نگرانی سے تھکتا نہیں مگر عارف کو اگر اس کی جانب سے
غفلت ہو جائے تو اس کی وہ "مخلوق" معدوم ہو جائے گی۔ ۱۲

Marfat.com

یا "کابوس" کہتے ہیں اور عموماً عنفوانِ شباب میں بعض آدمی اس میں مبتلا ہو جاتے
ں ۔اس بیماری میں اضطراری طور پر انسان کی تخلیقی قوت اور اس کی توجہ ایک نقطہ
نیند میں ٹھہر جاتی ہے جس کے بعد آدمی بے چین ہو کر بیدار ہو جاتا ہے لیکن
جہ میں پھر بھی انتشار نہیں پیدا ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی خیالی مخلوق
سے سونے والے کے "کن فیکونی ارادہ" نے نیند میں پیدا کیا تھا اس کے سامنے
ڑی ہو جاتی ہے ، اگرچہ دوسرے لوگ جو اس بیمار کے پاس ہوں وہ کچھ نہیں
نتے ، کچھ نہیں دیکھتے لیکن خود یہ بیمار نہایت صفائی کے ساتھ اپنی اسس
خیالی مخلوق " کے رنگ اور مقدار کو دیکھتا ہے ، وزن کو محسوس کرتا ہے
چلا اُٹھتا ہے کہ کوئی بھوت پریت اس کے سامنے ہے ۔ حالانکہ وہ خود اس
خیالی مخلوق " ہے اس قسم کے لوگوں کو بعض دفعہ ویرانوں اور جنگلوں میں
حالتِ بیداری بھی اسی طرح کا دورہ پڑ جاتا ہے اور اپنے پیدا کیے ہوئے
ں بھوت سے خود ہی بھاگتے ہیں ۔

(دُوسرا سوال)

اس سلسلہ کا دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ پیدائش سے پیشتر خدا کو عالم کا علم
س طرح ہوا حتیٰ کہ کن فیکونی قوت سے اس کی تخلیق پہ وہ قادر ہوا کیونکہ
چیز موجود نہ ہو اس کے معلوم ہونے کی کوئی نظیر ہمارے سامنے نہیں ہے ؟

(جواب)

ظاہر ہے کہ اس سوال کی بنیاد حق تعالےٰ کے علم ازلی کے انکار پہ مبنی ہے
س میں قادرِ ذوالجلال کو کمزور انسان پہ قیاس کیا گیا ہے ، گویا جس طرح انسان

Marfat.com

کسی چیز کو اس کے موجود ہونے سے پیشتر نہیں جان سکتا، سمجھا گیا ہے کہ یہی حال خ
بھی ہے، حالانکہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ چیونٹی جس بوجھ کو نہیں اٹھا سک
اس پر قیاس کر کے ہاتھی کے لیے بھی اس بوجھ کا اٹھانا ناممکن تبلایا جائے،
یہ کلیہ بھی صحیح نہیں کہ کسی چیز کا معلوم ہونا اس کے موجود ہونے پر موقوف
ہم بہت سی ایسی چیزیں سوچتے ہیں اور سوچ سکتے ہیں جن کو کبھی نہیں دیکھ
مثلاً جزو کو دیکھ کر کل کے متعلق سوچتے ہیں، موجود عالم کو معدوم فرض کر
ہیں، حالانکہ عالم کو جب ہم نے دیکھا موجود ہی دیکھا ہے، پس جس طرح
موجود کو معدوم خیال کر سکتے ہیں کیا ہوا اگر خدا نے بھی معدوم عالم کو مو
فرض کر لیا۔

عالم کی حقیقت

اور یہ تو اجمالی جواب تھا مسئلہ کی صحیح تحقیق کرنے کے
ہمیں سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ جس چیز
ہم عالم یا کائنات کہتے ہیں خود اس کی حقیقت کیا ہے سنا ہوگا کہ قدیم
فلسفیوں نے تمام چیزوں کی آخری حقیقت خاک[1] و باد[2] آب[3] و آتش[4] قرار د
پھر اس خیال میں ترمیم ہوئی اور اسی[8] تراسی کیمیائی بسائط کا نظریہ قائم کیا گ
اور اب کہا جاتا ہے کہ تمام کائنات کے آخری تحلیل برقی پاروں میں ختم ہو
ہے اور بعضوں نے تو اب اس کا بھی اعلان کیا ہے کہ یہاں جو کچھ ہے صرف
انرجی اور توانائی کی مختلف شکلیں ہیں — بہرحال حقیقت عالم کے متعلق ا
تک سائنس والوں کی یہ رائے ہے۔
نیز آپ کو یاد ہوگا ابتدائے درس میں میں نے فلسفیوں کے اس گروہ کا

Marfat.com

...تھا جو سارے عالم کو چند گنے گنائے اوصاف پر ختم کر دیتے ہیں، اُن کو ...نگی ہیں زردی، ترشی، طول و عرض وغیرہ چند صفات کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں ...، وہ شجر و حجر، ثوابت و سیارات، شمس و قمر سب کو صرف رنگ و روشنی کے ...تلف مظاہر سمجھتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ ان دو صفتوں یعنی رنگ و روشنی کو ...لم سے سلب کر لو تو پھر آنکھ کے لیے یہاں کچھ بھی نہیں رہتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے ...رنگ بھی بالآخر روشنی ہی کے چند کھیلوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

الغرض کثرت کی اُن گوناگوں اور لامحدود موجوں کو جن کا دوسرا نام کائنات ...عالم ہے، وحدت کے سمندر میں گم ہوتے ہوئے وہ بھی پاتے ہیں جنھوں نے ...قعہ یہ ہے کہ اب تک کچھ نہیں پایا ہے، لیکن جس شخص کی پہلی یافت " الحمدللہ ...ب العالمین " کی ہو اور جو اس حقیقت کو سمجھ چکا ہو کہ اس عالم میں ایسی کوئی چیز ...ہیں ہے جو اصلاً نہ تھی، بلکہ یہاں ساری " نمود " " بود " ہی کی ہے اور اس ...لم میں جہاں کہیں جو کمال جو صفت جس شان جس شکل میں بھی نظر آتی ہے وہ اس کا ذاتی ...ل یا صفت نہیں بلکہ سب رب العالمین کے شئوُن و صفات کمالات و حسنات کی ...تلف شانیں ہیں جو مختلف مدارج کے لحاظ سے مختلف پیمانوں پہ نمایاں ہو رہی ...یں، پس جس نے اس حقیقت کو پا لیا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ عالم کی پیدائش کے ...یے عالم کے جاننے کی ضرورت نہیں بلکہ حق تعالےٰ کو اپنی ذات و صفات کا جاننا ...ور اُن کا علم بس یہی کافی و وافی ہے کہ یہی کمالات و شئوُن و صفات در اصل عالم ...حقیقتیں ہیں الغرض ظاہر ہے کہ ازل میں خدا تھا اور خدا کے ساتھ اس کے لامحدود ...لات و صفات تھے، وہ ان تمام چیزوں (ذات و صفات) کا عالم تھا پس

Marfat.com

اس نے اپنی جن صفات کو جس پیمانے پر جن دوسرے صفات کے ساتھ جس ترتیب
کے ساتھ تصور کیا[1] اور جب اور جس وقت چاہا اس تصور کو کن فیکونی قوت سے خ
آفرینش کا رنگ دے کر ظاہر فرمایا تو اس کے لیے خدا کا خود اپنی ذات
صفات کا علم یقیناً کافی ہے گویا بقول عراقی باہر سے نہیں بلکہ پیدائش عالم

نخستین بادہ اندر جام کردند   ز چشم مست ساقی دام کردند

یعنی خود ساقی کی چشم مست سے دام وقرض لیا گیا۔

قرآن نے اسی مسئلہ کی طرف اپنی مشہور آیۃ

"اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔"

میں اشارہ کیا ہے، نیز مشہور حدیث ہے۔

"کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًا فاحبت ان اعرف فخلقت الخلق۔"

(میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں تو

---

[1] اسماء وصفات کی باہمی ترکیبوں سے لاتعداد ولاتحصی جو صورتیں علم الٰہی میں پ
ہوئیں ان ہی کا نام اعیان ثابتہ، اسماء کونیہ وغیرہ ہے کن فیکونی قوت کے زیر
آنے سے پہلے اجمال وتفصیل کے حساب سے علم الٰہی کی ان صورتوں کے جو
فرض کیے جا سکتے ہیں اُن ہی کی تعبیر علمی تصوف میں احدیت، وحدیت، واح
وغیرہ اصطلاحی الفاظ سے کی جاتی ہے لیکن ان اصطلاحات سے واقعات کے
سلجھانے میں بظاہر کوئی مدد نہیں ملتی اس لیے میں نے ان غیر ضروری تفصیلا
کا ذکر بھی غیر ضروری خیال کیا۔۱۲

Marfat.com

پیدا کیا میں نے مخلوقات کو)

مطلب یہ ہے کہ اسمارحسنیٰ جس قدوس اور سبوح کے ساتھ مخصوص ہیں اور جس کے کمالات یا کلمات کے لکھنے کے لیے نہ سمندر کا پانی اور نہ دنیا کے درخت کافی ہو سکتے ہیں، اور جس کے متعلق خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا "لا أحصی ثناءً علیك أنت كما أثنيت على نفسك"

(تیری خوبیوں کو میں تو گن نہیں سکتا، بس تو ایسا ہے جیسا کہ تو نے خود اپنے متعلق فرمایا)

پس اسی حی و قیوم نے اپنے غیر محدود اسماء اور بے شمار صفات کو جب اپنا غیر فرض کیا تو اسی کا نام عالم ہوگیا، اگرچہ حق تعالےٰ مثل سے پاک ہے لیکن صرف سمجھنے سمجھانے کے لیے یہ مثال دی جا سکتی ہے کہ جس طرح کبھی کبھی شاعر اپنی بینائی کو نرگس میں، گویائی کو، سوسن میں شنوائی کو غنچہ میں حسرت و درد کو، لالہ میں، اپنے استقلال کو ساحل میں اور بے چینی کو دریا میں فرض کرتا ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تنہائی میں خود اپنی ذات کو اپنا غیر اعتبار کر کے گھنٹوں اس سے سوال و جواب بھی کیا کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اپنی ذات و صفات کے متعلق اس عمل کے کرنے سے ہماری ذات یا صفت میں کوئی عیب یا نقص نہیں پیدا ہو جاتا، شلاً اگر ہم کسی میں اپنی صفت بینائی فرض کریں تو اس فرض کی وجہ سے میری بینائی میں تو کوئی کمی پیدا نہیں ہو جاتی، پھر اگر غیر محدود اسمار و شیون، صفات و کمالات والے نے مختلف مدارج کے لحاظ سے ان کو اپنا غیر فرض کیا تو اس سے ذاتِ حق کی طرف کیا نقص عاید ہوتا ہے یا اس

Marfat.com

ہیں کیا کمی پیدا ہوتی ہے البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ ہماری ارادی قوت اور کن فیکونی طاقت
چونکہ کمزور ہوتی ہے اس لیے ہمارے مفروضات صرف مفروضات بن کر رہ جاتے
ہیں اور ان سے واقعی آثار کا ظہور نہیں ہوتا مثلاً ہم آگ کو اپنے ذہن میں پیدا
کر لیتے ہیں لیکن اس سے سوزش اور روشنی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے بخلاف
حق تعالیٰ کے کہ اپنی جس صفت جس کمال کے جس درجہ کو جس جگہ جس مقدار میں فرض
فرماتے ہیں اسی حد تک ان کا یہ فرض خلق اور آفرینش بن جاتا ہے، مثلاً جس میں
اپنی صفت حیات جس مقدار میں فرض کرتے ہیں اس میں علم پیدا ہو جاتا ہے۔
الیٰ غیر ذالک۔ بہرحال اُن کے مفروضات، مخلوقات بن جاتے ہیں اور اُن سے
واقعی آثار کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

الحاصل "عالم کو خدا نے کس طرح پیدا کیا ؟" اس کا جواب تو مسئلہ قیومیت
تھا۔

خدا نے عالم کو کس چیز سے پیدا کیا ؟

اب دوسرا مستقل سوال ہے کہ خدا نے عالم کو کس چیز سے
پیدا کیا ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کثرت کی بنیاد اُن غیر متناہی اسماء حسنیٰ
اور بے شمار کلمات پہ قائم ہے جو ہر لحظہ و ہر آن کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کے سرچشمہ
جلال سے اُبل رہے ہیں بقول جامی ؎

زاں سایہ کہ افگندی بر خاک گہہ جلوہ ۔۔۔ دارند ہمہ خوباں سرمایۂ زیبائی!

اسی کی طرف مغربی نے بھی اشارہ کیا ہے ؎

ز دریا موج گوناگوں بر آمد ۔۔۔ ز بے چونی برنگ چوں بر آمد

Marfat.com

گہے در کسوتِ لیلیٰ فروشد گہے در صورتِ مجنوں بر آمد

رہ گئی یہ بات کہ عالمِ کثرت کی کون سی چیز حق تعالیٰ کی کس صفت اور کس اسم کی آئینہ بردار ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس کا بتانا آسان نہیں ہے ، کامل طور پر اس کا علم اسی کو ہو سکتا ہے جو اسماءِ حسنیٰ میں سے ہر اسم کے ہر درجہ کا علم رکھتا ہو اور اسی طرح عالم کی بھی ہر چیز کی آخری حقیقت کی معرفت بھی اسے حاصل ہو ئی ہو ــ میں بتا چکا ہوں کہ علم و معرفت کا یہ وہ مقام ہے کہ جہاں انسانیت کی آخری رسائی نے بھی ۔

" مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعرِفَتِكَ "

کا اقرار کیا ہے ۔

" تا بہ دیگراں چہ رسد "

ایک عامی انسان کی لذت پذیری کے لیے معرفت کی یہ اجمالی روشنی بھی ؎

دیدۂ آئینہ دار طلعت اوست دل سراپردۂ محبت اوست

کا حال پیدا کرنے کے لیے کافی ہے ، تفصیلی طور پر سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن حواس ظاہری اور باطنی سب پہ ؏

ہر جا کہ نظر کردم سیمائے تو می بینم

کی خنک اور شیریں موجیں ٹکراتی رہتی ہیں[1] اور قرآن کی تعلیم کا سب سے پہلا ابتدائی سرا " الحمد للہ رب العالمین " جو ہمتوں کے لیے صرف تقلیدی معرفت

---

[1] حقیقت تو یہ ہے کہ جب تحلیل و تجزیہ کے بعد عالم کی تعمیر کا آخری سرمایہ صرف (بقیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

کی حیثیت رکھتا ہے، مگر جاننے والوں کے لیے حقیقت کے آغاز کا ابتدائی نقطہ یہی ہے جس نے یہ پالیا وہ انشاء اللہ آخر تک پاتا چلا جائے گا۔ لیکن جیسے الفاظ کے علاوہ قرآن کی اس اساسی و افتتاحی تعلیم میں معنی کا کوئی حصہ نہ ملا مشکل سے

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) صفات و اسمائے حق ٹھہرتے ہیں پھر ان ہی کی باہمی ترکیب سے جو مختلف صورتیں علم الٰہی میں مرتب ہوئیں حق تعالےٰ اپنے ان ہی معلومات کی شکل میں متجلی ہوا ہے، مظاہر تو حقائق عالم ہیں، لیکن ظاہر اس میں خود ذات حق ہے علی الخصوص جب خالق کسی شعوری مخلوق کی شکل میں ظاہر ہوا اور اسے اپنا کن فیکونی مخلوق بنائے تو ایسی مخلوق کے شعور سے خالق کا علم جدا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے صوفیہ کے نزدیک حق کی یافت کی قریب ترین شکل یہ ہے کہ اپنے "انا" میں اس کے شعور کو بیدار رکھا جائے۔ اجمالاً اس کا شعور اگرچہ ہر عامی کو ہوتا ہے اسی لیے حق تعالےٰ کو مخاطب کرنے کے لیے اپنی شعوری توجہ کو ہر شخص کافی سمجھتا ہے۔ حدیث:-

انت الاولی فلیس قبلک شئ و انت الآخر فلیس بعدک شی و انت الظاہر فلیس دونک شی (یعنی تو ہی پہلے ہے تجھ سے پہلے کچھ نہیں ہے تو ہی آخر ہے تیرے بعد کچھ نہیں ہے۔ تو ہی ظاہر ہے تیرے اوپر کچھ نہیں تو ہی باطن ہے تیرے آگے کچھ نہیں۔

یا حدیث احفظ اللہ تجدہ تجاھلک

(یعنی خدا کو یاد رکھو اسے اپنے سامنے پاؤ گے) وغیرہ میں ان ہی اعتبارات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۱۲ لیکن صوفیا اسی اجمال کی تفصیل کی مشق کرا کے دوام حضور کے مقام پر مرید کو پہنچا دیتے ہیں۔

Marfat.com

آئندہ بھی اُسے کوئی ایسی چیز مل سکے جس کا ملنا دراصل ملتا ہے، بہر حال بجائے تفصیل کے اس مسئلہ میں ہمارے لیے اجمال میں بہت کچھ ہے۔ تاہم اس اجمال کے باوجود صفات الٰہیہ کے ظہور کی دوؔ کلی شکلوں کی طرف قرآن میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، صوفیہ اسلام کی اصطلاح میں اسی کی تعبیر "آفاق و انفس" سے کی جاتی ہے۔

آفاق و انفس

درحقیقت ان دونوں اصطلاحوں کا مآخذ بھی قرآن ہی کی وہ مشہور آیت ہے جس میں حق تعالےٰ نے اپنی نشانیوں کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:۔

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ اَلَآ اِنَّهُمْ فِىْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىْءٍ مُّحِيْطٌ ٥

(میں اپنے لوگوں کو آفاق اور انفس میں دکھاؤں گا۔ یہاں تک کہ کھل جائے گا ان پر کہ وہی خدا حق اور ثابت ہے کیا تیرے رب کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے، خبردار یہ لوگ اپنے مالک کی ملاقات میں شک کے اندر ہیں۔ خبردار وہ ہر چیز کو محیط ہے)

ارباب معرفت نے گزشتہ بالا آیات میں آفاق سے مراد کائنات کا وہ عریض وطویل سلسلہ لیا ہے جو انسان کے باہر ثوابت وسیارات، نباتات وجمادات، حیوانات

Marfat.com

و ملائکہ اور جن و شیطان وغیرہ کی شکل میں پھیلا ہوا ہے۔

اور النفس سے مراد خود انسان کی حقیقت اور اس کی ذات ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات اللہ کی تجلی ان دونوں چیزوں میں دو جداگانہ حیثیتوں سے ہوتی ہے۔

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اسماء حسنیٰ کی ایک تفصیلی جلوہ گاہ وہ ہستی اعظم ہے جسے اصطلاح میں شخص کبیر کہتے ہیں جس میں حق تعالیٰ اپنے تمام اسماء و صفات کے مختلف مدارج کے لحاظ سے جلوہ[1] فرما ہوئے ہیں اسی کا نام عالم اور آفاق ہے اور اسی شخص کبیر کو چھوٹے پیمانے پر بطور خلاصہ کے دوبارہ جب اختیار فرمایا گیا اور اسی کو مجمل و مختصر کر کے ایک اور ہستی نکالی گئی تو اسی کا نام انسان اور النفس ہو گیا ہے۔ اس چھوٹی شخصیت میں وہ سب کچھ ہے جو اس سے باہر ایک ایک

---

[1] یہاں تصوف کی ایک اصطلاح لفظ تجلّی کو سمجھ لینا چاہیے۔ عالم کا اپنے معلومات کی شکل میں ظاہر ہونا، مثلاً جبرئیل علیہ السلام کبھی دحیہ کلبی صحابی یا مسافر، یا رجل سولی کی شکل میں جو ظاہر ہوتے تھے تو اس کی حقیقت یہی تھی کہ اپنے معلومات کی شکل میں وہ ظاہر ہوتے تھے آدمی بھی جب اپنے ذہن میں اپنے کسی معلوم کو عالم خیال میں پیدا کرتا ہے تو کہہ سکتے ہیں کہ معلوم کی شکل میں وہ متجلی ہوا۔ ظاہر ہے کہ عالم خیال میں جو گدھے کا تصور مثلاً قائم کرتا ہے اس وقت وہ گدھا نہیں ہو جاتا بلکہ صرف اسی کا ظہور اپنے ایک معلوم کی شکل میں ہوتا ہے عالم کی مختلف چیزوں کی شکل میں حق کے ظہور اور تجلی کو بھی کچھ اسی پر قیاس کیا جاتا ہے۔ ۱۲

Marfat.com

چیز میں جُدا جُدا پایا جاتا ہے اسی بنیاد پر جدید زمانہ ہو یا قدیم ہمیشہ انسان "خلاصہ کائنات" یا بہ اصطلاح حال" ارتقا کی آخری منزل" قرار دیا گیا ہے۔

تصوّف کی کتابوں میں اس کی تفصیل مل سکتی ہے کہ کس طرح اس چھوٹے پیمانے میں وہ سب چیزیں اُتر آئی ہیں جو وسیع سے وسیع تر پیمانوں پر عالم کبیر میں پائی جاتی ہیں، کم از کم اتنا تو ہر عامی بھی جانتا ہے کہ انسان کا وجود ان تمام خواص و آثار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جن کے مظاہر عام طور پر جمادات و نباتات اور حیوانات وغیرہ مرکبات ہیں، اسی طرح کون نہیں جانتا کہ انسان سے باہر اگر مٹی ہے، پانی ہے، ہوا ہے، حرارت ہے تو تاریخ کے نامعلوم زمانے سے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری جسدی ترکیب میں بھی یہ ساری چیزیں شریک ہیں اور جب یہ ہیں تو جن کیمیائی بسائط سے ان عناصر کی ترکیب ہوئی ہے کیا کوئی اس کا انکار کر سکتا ہے کہ وہ بھی انسانی بدن کے اجزا نہیں ہیں۔ بلکہ عہدِ جدید کے کیمیائیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جتنے کیمیائی بسائط انسان سے باہر پائے جاتے ہیں، اُن کا ایک بڑا حصّہ ہماری جسدی تعمیر میں خرچ ہوا ہے البتہ بعض بسائط کا اب تک ان کو پتہ نہیں چلا ہے لیکن جو معلوم نہیں ہیں کیا ضروری ہے کہ وہ موجود بھی نہ ہوں بہرحال کم از کم ہر شخص اتنا تو ضرور جانتا ہے کہ انسانی وجود ان تمام خواص و آثار کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جو عام طور پر حیوانات، جمادات، نباتات وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

الحاصل جمادات ہوں یا معدنیات، نباتات ہوں یا حیوانات، بلکہ وہ ساری چیزیں جو حواس کی گرفت میں آسکتی ہوں کون نہیں جانتا کہ انسانی ہستی (وجود)

Marfat.com

ان تمام طبقات محسوسہ کے آثار و خواص کی "کتاب مجمل" اور نسخہ جامع "ہے بلکہ کہا جاتا ہے کہ علاج و معالجہ اور طبی دواؤں کی بنیاد عالم صغیر و کبیر کی اسی باہمی مناسبت پر قائم ہے حتیٰ کہ وہ نورانی اجرام جو اتھر کے لامحدود سمندر میں تیر رہے ہیں یا جو اُن کے پیچھے ہیں، اگو عوام الناس کو اس کا علم نہ ہو لیکن جن لوگوں نے انسان کے باطنی قویٰ کو کریدا ہے انھیں اس چھوٹے قالب میں عالم انوار کے وہ سارے نظامات منکشف ہوئے ہیں جو اس سے باہر پائے جاتے ہیں، نہ صرف صوفیانہ مجاہدات والے، بلکہ جوگیت و رہبانیت کی راہوں سے بھی جو انسان کے اندرونی حدود میں اترے ہیں ان کو قالب انسانی کے مختلف مقامات میں مختلف الوان انوار کے مراکز کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ مستقل مقامات پہ سرخ، سفید، سبز یا نیلگوں انوار کے نقطے قائم ہیں۔ ان کے کھل جانے کے بعد آدمی پہ ان نت نئے حالات کا انکشاف ہوتا ہے جن کا صحیح اندازہ صرف عقل و حواس رکھنے والوں کو نہیں ہو سکتا۔

مسئلہ لطائف و اسرار اور مسئلہ شق صدر

انوار باطنی کے ہی انشراح کا نام نبوت کے وہبی مقام میں "شق صدر" یا "شرح صدر" ہے اور جب کسب و کوشش ریاضت و مجاہدات سے اس کے دروازے کھولے جاتے ہیں تو اُن کو صوفیانہ اصطلاح میں "لطائف و اسرار" کہتے ہیں[1]۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ عالم انسانیت میں جس طرح مختلف

---

[1] یہاں اگر اس امر کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ شق صدر کے (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

Marfat.com

مقامات میں علم واحساس، تدبیر وتصرف کے مختلف ذرائع وآلات، مختلف حواس وقویٰ کی شکلوں میں جڑے ہوئے ہیں جن سے اس عالم صغیر کے مختلف فرائض متعلق ہیں جنھیں ہم سامعہ باصرہ، غاذیہ، نامیہ، وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ کچھ اسی طرح سے اس بڑے لمبے چوڑے شخص کبیر میں بھی ایسے مستقل ذرائع ووسائل زندہ ہستیوں کی صورت میں موجود ہیں جو اس بڑے عالم کے مختلف فرائض کو بغیر کسی سرکشی وعصیان کے انجام دیتے ہیں۔

انرجی یا توانائیوں کے ان زندہ مظاہر کو مذہبی زبان میں ملائکہ فرشتے، دیوتا وغیرہ الفاظ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بلکہ انسانی زندگی کا وہ تباہ کن رخ جس کی طرف ڈھلک جانے کے بعد اچھا خاصہ آدمی صرف شرارتوں اور گمراہیوں کا ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے، کیا غلط ہے اگر اس کو بیرونی کائنات کی اس چیز کا نمونہ

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) متعلق روایات میں آیا ہے کہ پانچ دفعہ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آیا۔ حلیمہؓ کے گھر میں دس سال کی عمر میں نزولِ وحی کے آغاز کے وقت، معراج کے وقت ایک دفعہ اور تفصیل تفسیر عزیزی حضرت شاہ عبد العزیزؒ میں دیکھیے (سورہ الم نشرح، نیز روض الانف سہیلی وزرقانی شرح مواہب وغیرہ) دوسری بات یہ ملحوظ رکھنی چاہیے کہ حضرت صوفیہ خصوصًا سہروردیہ نقشبندیہ میں لطائف واسرار کی مجموعی تعداد بھی پانچ ہی بتائی جاتی ہے۔ اس کے لیے کچھ نہیں تو فیض رحمانی وغیرہ مجددیہ نقشبندیہ کی کتابوں کا دیکھنا کافی ہو سکتا ہے ۱۲

Marfat.com

کہا جائے، جس کا مذہب کی زبان میں شیطان نام ہے۔ اور وہ جو صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک غیر مرئی ہستی پیدا کی جاتی ہے اور جس کا نام قدیم عالموں کی زبان میں ہمنا یا ہمزاد تھا اور جس پر عہدِ جدید کے اسپریچولزم والوں کے تجربات کی بنیاد قائم ہے[1]، کیا اس کے بعد اس میں شک رہ جاتا ہے کہ انسانیت کے عالم صغیر میں وہ چیز بھی موجود ہے جس کا بنہ آفاقی کائنات میں جن، بھوت

---

[1] یورپ و امریکہ کے ایک بڑے طبقہ میں آج کل ایسے اعمال کی مشق کا رواج بڑھتا جا رہا ہے جس کی بنیاد پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ مثلاً مُردوں سے گفتگو کی جا سکتی ہے، بلکہ کی جاتی ہے حالانکہ عموماً ان دعاوی کا ایک بڑا حصہ ادعا سے آگے نہیں بڑھتا ہے اور بالفرض اگر کسی کو اس میں بظاہر کامیابی نظر آتی ہو تو جہاں تک ارباب کشف وبطون کا تجربہ ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو اسپریچولسٹوں کا یہ گروہ مردوں کی روح باور کرتا ہے وہ واقعی مرے ہوئے لوگوں کی روحیں نہیں ہوتیں بلکہ عموماً شیاطین، اجنہ اور ہمزاد وغیرہ جیسی چیزیں ہوتی ہیں، وہی اپنا نام مُردوں کا نام رکھ کر ان لوگوں پر ظاہر ہوتی ہیں اور چونکہ ان باتوں کا بالکلیہ تعلق تجربہ و مشاہدہ ہی سے ہے اس لیے جو اس میدان کے مرد نہیں ہیں وہ ان حقائق کی اصلیت تک نہیں پہنچ سکتے، اسی کے ساتھ دجّال والی ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جن میں آیا ہے کہ دجال کے ساتھ شیطانی روحوں کی بھی امداد ہوگی، اپنا نام لوگوں کے مرے ہوئے ماں باپ و اعزہ کا رکھ کر دجال کی تصدیق کر کے یہ مغالطہ زندہ لوگوں کو دیں گے کہ واقعی ان کے مرے ہوئے اعزہ ہی زندہ ہو کر دجال کی تصدیق کر رہے ہیں۔

Marfat.com

چڑیل وغیرہ الفاظ کے ذریعہ سے دنیا کی ہر قوم نے ہر زبان میں دیا ہے۔
الحاصل صفاتی لحاظ سے جن جن چیزوں کا منظاہرہ آفاق میں ہوا ہے انفس میں کسی نہ کسی طرح وہ سب چیزیں کسی نہ کسی پیمانے میں ضرور پائی جاتی ہیں۔ صوفیا کے نزدیک بھی یہی مطلب ہے، قرآن کی اس آیت کا جس میں آدم کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ :-

"لما خلقت بیدی"

(یعنی میں نے آدمؑ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا ہے)

بالفاظ دیگر اپنے تمام صفاتِ جلالی وجمالی، سلبی و ایجابی کا اُسے منظہر بنایا ہے لیکن یہ صرف صفات کی حد تک بات تھی۔ الحاصل آفاق میں بھی ان ہی صفات کو فرض کر کے "کن فیکونی" عمل کے زیر اثر ایجاد کا رنگ بخشا گیا اور پھر چھوٹی بقطیع پہ اسی عمل کا ظہور انفس میں بھی ہوا۔

خلافت

اب صرف ایک بات رہ گئی کہ اب تک خدا نے اپنے اسماء و صفات کو اپنے سے باہر فرض کیا یا پیدا کیا لیکن خود اپنی ذات کو اپنا غیر فرض کر کے کوئی مخلوق نہیں بنائی، یہی وہ ارادہ تھا جس کا اعلان ملائکہ کے سامنے ازل میں

"اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہ"

سے کیا گیا۔ اور یہی ہوا کہ صفات کے اس نسخہ جامعہ میں یا عالم صغیر میں خود اپنے آپ کو اپنا غیر فرض کر کے

"نفخت فیہ من روحی"

Marfat.com

کا اعلان کیا گیا، اور جمادات سے لے کر ملائکہ تک کو اس کے آگے جھکنے کا حکم ہوا، اور اب جا کر پیکرِ آدم احسنِ تقویم کے سانچے میں ڈھل کر خدا کا خلیفہ بن کر آیا، یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے یعنی

"خلق اللہ آدم علیٰ صورتہٖ"

(پیدا کیا آدم کو اللہ نے اپنی صورت پہ)

پس شخصِ کبیر یا آفاق کے لیے جس طرح ایک روح یا نقطۂ مرکزی یا انا (خدا) تھا، اور ہے، اسی طرح اس شخص صغیر میں بھی ایک ایسا شعوری نقطہ پیدا ہو گیا۔ جس کو ہر شخص ہم میں سے اَنا یا مَیں وغیرہ، الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ جس میں وہ سارے شیون و اوصاف ہیں جن پہ شعوری یا غیر شعوری طور پہ الوہیت کا دھوکا ہوتا ہے اور خدا جانے کتنوں کو ہوا ہے۔

انسانیت کا یہی بلند مقام ہے جس کی بلندی کا اظہار روم کے عارف نے ان لفظوں میں فرمایا:-

منگر بہ ہر گدائے کہ تو خاص ازاں پاکی !

مفروش خویش ارزاں کہ تو بس گراں بہائی

بعصا شگاف دریا کہ تو موسیٰ زمانی !

بدراں قبائے مہ را کہ تو نور مصطفائی

بخراش دستِ خوباں کہ تو یوسف جمالی

چو مسیح دم فرودم کہ تو نیز ازاں ہوائی

Marfat.com

بصف اندر آئی تنہا کہ سفندیار وقتی !

درِ خیبر است بہ کن تو علیِ مرتضائی

چو خلیل رو و در آتش کہ تو خالقی و دلکش

چو خضر بہ آب حیوان کہ تو جوہر بقائی

بکسل ز بے اصولائی مشنو فریب غولاں

کہ تو آں شریف اصلی کہ تو از بلند جائی

تو ز نور لایزالی ز ورد نہ خوش جمالی !

تو ز فیض ذو الجلالی کہ تو پر تو خدائی

تو ہنوز ناپدیدی کہ جمال خود نہ دیدی

سحرے چو آفتابی ز درون خود برائی

تو ز خاک سر بر آور کہ درخت بس بلندی

تو برید بکوہ وحدت کہ شریف تر ہمائی

توئی آں دُرے کہ فانی دو ہزار بحر در تست

توئی بحر بیکرانہ ز صفات کبریائی

(منقول از دیوان مولانا رومی کہ مشہور بہ دیوان شمس تبریز است)

حقیقتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الف تحیۃ یہی خلافتِ اللہ ہے جس کا انسان مظہر ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ شیون الٰہی اپنے مدارج کے لحاظ سے غیر محدود ہیں اسی طرح خلافت عامہ تو ہر انسان کو حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ مدارج کے اختلاف نے اس کو بے شمار افراد میں

Marfat.com

بانٹ دیا ہے تاہم عقل یہ تجویز کرتی ہے کہ خلافت کے درجات کو مکمل ہوتے ہوئے بالآخر ایک ایسی ہستی پر ختم ہونا چاہیے جو تمام اسماء و صفات اور ذات کا مظہرِ اتم ہو اور وہی "دُرِّ فرید" نوعِ انسانی کا کامل ترین فرد بلکہ تکوین و تخلیق کا آخری نتیجہ قرار پا سکتا ہے۔ کائنات کے ارتقائی درجات و طبقات کی رفتار کو دیکھ کر نہ صرف وجدان و بصیرت والے بلکہ عقلی روشنی کے سہارے چلنے والوں نے بھی کبھی کبھی اس فردِ کامل کو انسانیت کی طویل الذیل تاریخ میں تلاش کیا ہے۔ حتیٰ کہ متاخرین فلاسفہ میں جرمنی کے مشہور مفکّر نیٹشے نے تو اپنے سارے فلسفہ کی بنیاد وہی ارتقا کی اسی آخری تقویم یا قلب کی تلاش پہ رکھ کر مافوق البشر کا نظریہ قائم کیا، لیکن جس مسئلہ میں عقل سے زیادہ نورِ ایمان کی روشنی درکار ہے وہاں صرف عقلی احتمالات سے کسی یقینی نتیجہ تک پہنچنا مشکل ہے۔

کاش اُسے معلوم ہوتا کہ اس سے بہت پہلے آسمانی آواز نے خلقِ عظیم والے کو عالمین (سارے جہاں) کے لیے رحمت بنا کر دنیا میں یہ کہتے ہوئے متعین کر دیا ہے کہ وہی کمالاتِ انسانی جو رفتہ رفتہ ارتقاء پا کر نبوت و رسالت تک پہنچتے ہیں اب نبیوں کے ان کمالات کا خاتم نسلِ آدم میں آ کر سارے اسماء و صفات کے تخلیقی دائرہ کا انتہائی اور آخری نقطہ۔

محمّد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم

کی ذات میں ظاہر ہو گیا، اور یوں عالمین کے رب کی ساری حمد ساری ستائش سارے کمالات مخلوق بن کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اطہر میں مکمل ہو گئے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ محمد صرف نام ہی نہیں ہے بلکہ قدرت کا آخری کام بھی ہے۔

Marfat.com

ختم نبوّت آخر بتایا جائے کہ کیا انسانی کمالات کے آخری زینے وہ نہیں ہیں جہاں انبیاء و رسل کھڑے ہیں۔

ماننے والوں کو جانے دیجیے کیا انکار کرنے والوں نے نبوت و رسالت کے الفاظ کو چھوڑ کر ریفارم اور اصلاح کی آڑ میں کسی نہ کسی طرح پھر اسی کا اقرار نہیں کیا ہے اب سوچنا چاہیے کہ ہم میں رسول بن کر وہ کون آیا جو اپنی نبوت کے ساتھ ساتھ پیہم ختم نبوت کے دعوے کا بھی اعلان کر رہا تھا "میرے بعد صرف قیامت کا انتظار کرو۔" اس تاریخی پیشین گوئی کا چھوڑنے والا نسل انسانی میں کون تھا دیکھتے سب ہیں لیکن کم لوگوں کو سوجھا کہ اس دعوے کے بعد نبوت کا کوئی دعوی بنی آدم کی بستیوں میں کیوں سرسبز نہیں ہوا اور نہیں ہو رہا ہے؟ کیا بات ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کی تاریخ اس دعوے سے پہلے ہی کیوں شروع ہوتی ہے؟

لہ ظہورِ اسلام کے بعد بعض یہودیوں نے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف ختم نبوت کے دعوے کو منسوب کرنے کی جسارت کی لیکن منجملہ بیسیوں سوالات کے ایک بڑا سوال یہی ہے کہ مسیح علیہ السلام نے جب نبوت کا دعویٰ یہودیوں کے آگے پیش کیا تھا اُن پر یہودیوں نے یہ اعتراض کیوں نہیں کیا کہ نبوت تو موسیٰ پر ختم ہو چکی بہرحال ختم نبوت کے دعوے کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرنا محض مسلمانوں کے مقابلے میں ایک افترائی دعوے یہودیوں کی طرف سے پیش ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھو:۔

"الاقتصاد فی الاعتقاد" مصنفہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ۔ ۱۲

Marfat.com

آخر جس نوع کے اکثر افراد اب بھی کسی نبی کو مانتے ہیں کیسے کہا جائے کہ انھیں لوگوں میں نبوت پر اعتقاد کرنے کا جذبہ مفقود ہوگیا ؟ ہاں مفقود ہوگیا ہے لیکن صرف خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پچھلوں پر، ورنہ اگلوں پر، جو آپ سے پہلے نبوت کے دعوے کے ساتھ آئے، اُن پہ ایمان لانے والوں کی دنیا میں کیا کمی ہے ؟ اس انگریزی مفکر کا سوال خود اُس کے ہم وطنوں کے لیے قابل غور ہے کہ جب جذباتِ انسانی کے ہر شعبہ میں انقلاب برپا کرنے والے آرہے ہیں تو پھر بتایا جائے کہ جذبۂ مذہبی کے انقلابیوں کا سلسلہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کیوں رُک گیا ؟ حالانکہ مذہب کی تاریخ میں اتنے طویل وقفہ کا تجربہ نسل انسانی کو کبھی نہیں ہوا۔

نبوّت محمدیہ کے بعد نبوّت کا ہر دعویٰ فالتو نبوت کا دعویٰ ہے

اور سچ تو یہ ہے کہ قدرت اور اُس کی کارفرمائی نے مختلف ذرائع سے دورِ محمدی کے بعد بکھری ہوئی دنیا کو وحدت کے جس نقطہ تک پہنچا دیا ہے اور پہنچا رہی ہے، نیز تعلیمات و ہدایات کی حفاظت بلکہ نشر و اشاعت کے لیے مختلف شکلوں میں اتنے ساز و سامان مہیا کر دیے گئے ہیں کہ اس کے بعد کسی فالتو نبی اور اس کی فالتو کتاب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔

اب دنیا ایک ہے، ایک بستی ہے، ایک آبادی ہے، پس اس کا نبی بھی ایک ہے اس کی کتاب بھی ایک ہے۔

الحاصل اگر درخت سے پھل پہچاننے کا لوگوں میں سلیقہ نہیں ہے تو پھل

Marfat.com

ہی سے درخت کو یہ کیوں نہیں پہچانتے ؟ اور انشاء اللہ دنیا اس کو پہچان کر رہے گی ا جو آج نہیں پہچانے گا اُسے منتظر رہنا چاہیے کہ کل اسی کو مقام محمود والے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے لوا ، حمد کے نیچے اس واقعہ کا اعتراف اس وقت کرنا پڑے گا جب حقیقت النانیہ ایک دفعہ سمٹ کر

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

کا نعرہ لگائے گی

یہ تھی اس مسئلہ کی ایک گونہ تفصیل جسے عام طور پر وحدت الوجود سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

وحدتِ شہود اور مسئلہ شر کی توجیہہ

لیکن ابھی اس مسئلہ کا ایک پہلو اور تشنہ ہے ، سوال یہ ہے کہ جب کائنات وما فیہا کا سارا سرمایہ "چشم ساقی" سے "دوام[1]" لے کر حاصل کیا گیا ہے یعنی حق تعالےٰ نے اپنے ہی کمالات وصفات ، اسماء وشیون کو اپنے سے باہر فرض کر کے پیدا کیا ہے تو پھر اس عالم میں ناقص وعیب دار ، مضر اور موذی چیزیں کیوں ہیں ، کیونکہ ظاہر ہے کہ خداوند قدوس اور اس کے سارے اسماء ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہیں ۔

شر کی توجیہہ میں بعضوں کے خیالات

اس مسئلہ کے متعلق بدھسٹ ہندو ، پارسی مذاہب اور ابن رشد وغیرہ

---

[1] یعنی قرض لے کر ۔ ۱۲

Marfat.com

کے خیالات پڑھنے چاہییں [۱]۔

---

[۱] بدھ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ وہ شر کی علت انسان کی جزئی تمناؤں کو قرار دیتا تھا ان ہی جزئی تمناؤں کا تصادم جب ارادہ کلیہ سے ہوتا ہے تو انسان اس کی تعبیر شر سے کرتا ہے یا یوں کہو کہ جب جہل، علم سے ٹکراتا ہے تو اس سے وہ شئے پیدا ہوتی ہے جسے ہم شر کہتے ہیں، اس کے بعد ازالۂ شر کی تدبیر یہ بتائی جاتی ہے کہ انسان ہر قسم کی آرزوں تمناؤں سے معرّا اور خالی ہو کر اپنے جہل کو علم مطلق کے دھارے پر بے تحاشہ چھوڑ دے پھر نہ شر رہے گا، نہ دکھ نہ درد یقیناً یہ ایک اچھا شعر ہے جو کہا گیا، لیکن کیا یہ تمنائے حقیقت جس کا دوسرا نام انسان ہے وہ تمناؤں سے دستبردار ہو سکتا ہے؟ قدرت پر یہی تو اعتراض ہے کہ آرزوں سے بھرے ہوئے انسان کو کیوں پیدا کیا؟ اور پیدا کیا تھا تو اس کی تکمیل کی صورت پیدا کی ہوتی، پیاسا بنا کر پانی سے محروم رکھنا اس سے بڑا الزام قدرت پر اور کیا ہو سکتا ہے، ہندوؤں نے تناسخ سے اس کو حل کرنا چاہا ہے مگر صفاتی تفاوت کی بنیاد اگر تناسخ پر رکھی جائے تو سارا عالم صرف سزا یافتہ بن کر رہ جاتا ہے، یعنی جمادات میں نباتات کے مقابلہ میں، نباتات میں حیوانات کے مقابلہ میں، حیوانات میں انسان کے مقابلہ میں، پھر انسانوں میں عورتوں کے اندر مردوں کے حساب سے جو فطری کوتاہیاں پائی جاتی ہیں کہنا پڑے گا کہ یہ سارے نقائص و شر دراں سب میں اُن کے گزشتہ کرم اور عمل کا نتیجہ ہیں گویا عالم کا ذرہ ذرہ اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے، عالم نہ ہوا سزا یافتوں کا گویا ایک کیمپ ہو گیا (بقیہ ص۱۳۷ پر)

Marfat.com

اصل یہ ہے کہ اس مسئلہ کے سمجھنے میں ایک اصولی غلطی کی جاتی ہے یعنی ناقص اور مضر چیزوں کو ایک ہی سوال میں درج کرکے جواب دیا جاتا ہے، حالانکہ اصل حقیقت تک پہنچنے کے لیے اس طرح سوچنا چاہیے کہ

عالم میں ناقص چیزیں کیوں ہیں، یعنی کائنات کے مختلف انواع مثلاً جمادات، نباتات کے، نباتات حیوانات کے اور حیوانات انسان کی صفات سے کیوں محروم ہیں، یا یوں کہو کہ ایک ہی نوع کے مختلف افراد میں صفاتی تفاوت کیوں ہے، مثلاً انسان ہی کے مختلف افراد صورت و شکل، دل و دماغ بلکہ کبھی کبھی مختلف حواس و آلات ادراک کے اعتبار سے کیوں مختلف ہیں، مثلاً

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یوں ہی پارسیوں نے ایک ہی چیز کے دو پہلو خیر و شر کو دیکھ کر دھوکا کھایا اور ایک مخلوق کے لیے دو خالق کا احمقانہ نظریہ پیش کیا، آخر کھلی ہوئی بات ہے کہ دنیا کی ایک ہی چیز مثلاً آگ سے جب روٹی پکتی ہے روشنی ملتی ہے تو ہم اُسے خیر سمجھتے ہیں، پھر یہی آگ جب گھروں کو جلاتی ہے تو اُسی کو شر قرار دیتے ہیں الغرض خیر و شر عموماً ایک ہی چیز کے صحیح و غلط استعمال سے پیدا ہوتا ہے پس ایک ہی شے کے لیے دو خالق کی تجویز بوالعجبی نہیں تو اور کیا ہے ابن رشد نے قدرت پر حملہ کیا۔ اُس نے کہا کہ خدا اس آگ کو کس طرح پیدا کر سکتا ہے جس سے کھانا تو پک جائے لیکن گھر نہ جلے؟ کیا اس کے معنے یہ نہ ہوئے کہ خدا عاجز ہے، وہ شر سے جدا کرکے خیر محض کو پیدا کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک علواً کبیراً ۔

Marfat.com

کوئی خوب صورت ہے اکوئی بد صورت، کوئی ذہین ہے کوئی غبی حتیٰ کہ کسی کی بینائی تیز ہے اور کسی کی شنوائی بلکہ جہاں عام طور پر لوگ بینائی کا کمال لے کر پیدا ہوتے ہیں دیکھا جاتا ہے کہ کبھی کبھی آدمی اس کمال یا صفت سے محروم بھی پیدا ہوتا ہے الحاصل غور اس پر کرنا چاہیے کہ اشیاء عالم کے اس صفاتی تفاوت کا راز کیا ہے اس کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ عالم میں ناقص چیزیں کیوں پائی جاتی ہیں مگر عام طور سے یہ غلطی کی جاتی ہے کہ یہاں اس نقص ہی کو شر قرار دے کر پوچھا جاتا ہے کہ "کامل خدا سے ناقص مخلوقات کی پیدائش کیسے ہوئی ؟"

لیکن غالباً گزشتہ بالاتفصیل پر غور نہیں کیا گیا ورنہ میں بتا چکا ہوں کہ عالم کی ہر ہر چیز حق تعالےٰ کے تمام صفات اور اس کے اسماءِ حسنیٰ کی مظہر اور آئینہ بردار نہیں ہیں، بلکہ بتدریج مختلف اشیاء میں مختلف صفات کے مختلف مدارج کا ظہور ہوا ہے اور ہو رہا ہے، کسی میں ایک، کسی میں دو علیٰ ہذا القیاس بڑھتے بڑھتے ایک ذات پر ظہور کی یہ جنبش ختم ہوتی ہے، سمجھا جا سکتا ہے کہ ایسی صورت میں کسی ایک شئے میں ان تمام کمالات کو تلاش کرنا جن سے مستجمع کمالات یعنی ذاتِ حق موصوف ہے کس قدر عجیب تلاش ہوگی، وہ دیوانہ ہے جو صرف آکسیجن یا صرف ہائیڈروجن میں اُن آثار و خواص کو تلاش کرتا ہے جو ان دونوں کے باہمی اجتماع سے پانی کی شکل میں پیدا ہوتے ہیں لیکن جہاں آکسیجن پانی کے خواص سے محروم ہے تو کیا اپنی جگہ وہ خود ذاتی خواص و آثار بھی نہیں رکھتا ہے ؟ اور یہی حال تمام اشیاء عالم کا ہے، بلاشبہ اُن میں ایک ایک چیز اُن کمالات و اوصاف سے قطعاً محروم ہے جو ذاتِ حق کے ساتھ مخصوص ہیں جہاں سارے بکھرے ہوئے

Marfat.com

کمالات سمٹ کر بہ شانِ اجتماعی پائے جاتے ہیں، لیکن اپنی جگہ یہ وہ جس کمال کا جس حد تک مظہر ہے کون ہے جو اس سے بھی اس کو محروم قرار دے سکتا ہے لوگوں کو مغالطہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ عالم کی چیزوں کا باہم ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں اور اس کے بعد عیب یا نقص کا حکم لگاتے ہیں، مثلاً نباتات کو حیوانات سے، یا اندھوں کو سونکھوں سے ناپتے ہیں اور پھر ان کی طرف نقص یا عیب کو منسوب کرتے ہیں، حالانکہ اگر وہ کمالات کی کسی ایک صفت سے محروم ہیں تو کیا اسی وقت دوسرے کمالات کی وہ آئینہ بردار نہیں کہلاتے ہیں؟ یقیناً جو چیز جس صفت کی مظہر نہیں تھی پھر اُس صفت کو اُس میں تلاش کرنا اُس شئے کا نقص نہیں، بلکہ تلاش کرنے والے ہی کا جہل ہے، جو صرف نمک میں قورمہ کا مزہ تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا تبلاؤ کہ یہ نمک کا قصور ہے یا اس ڈھونڈنے والے کا؟

پس اصل یہ ہے کہ عالم کا ہر ذرّہ صفاتِ الٰہیہ کے مختلف اصناف و مدارج کا مظہر ہے، اس لیے ایک آثار و خواص کا دوسرے میں پایا جانا یقیناً ناممکن ہے — جدید تحقیقات میں یہ نظریہ جو قائم کیا گیا ہے کہ عالم کی مشابہ سی مشابہ چیزیں واقع میں مشابہ نہیں ہیں، حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ گلاب کی دو پنکھڑیاں بھی باہم ایک دوسرے کی حقیقی مثنیٰ نہیں ہیں، یہ صوفیائے کرام کے اس دعوے کی توثیق ہے کہ تجلیات میں تکرار نہیں ہے ورنہ حق تعالےٰ کی طرف عبث کاری کا الزام عائد ہوگا، یعنی ایک ہی صفت کے ایک ہی درجہ کو دو دفعہ ظاہر کرنا بے فائدہ ہے۔

Marfat.com

"اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ"
(یعنی ہر چیز کو ہم نے ایک خاص اندازے سے پیدا کیا ہے) وغیرہ
آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اسی کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کرتے:۔
کل شیءٍ بقدر حتی العجز والکیس - (جمع الفوائد بحوالہ مالک و مسلم)
"ہر چیز تقدیر ہی سے ہے حتیٰ کہ کسی کا دانش مند ہونا، کسی کا عاجز و کودن
ہونا یہ بھی تقدیر ہی سے ہے۔"
مطلب یہ ہے کہ نہ صرف بیرونی اوصاف کا اختلاف بلکہ اندرونی لحاظ سے
بھی افراد انسانی جو باہم مختلف ہیں یہ اُن اسماء ہی کا نتیجہ ہے جن کے ہم مظہر واقع ہوئے
ہیں۔ کسی کا طاقت ور ہونا اور کسی کا کمزور ہونا، کسی کا حسین ہونا، کسی کا بدصورت ہونا
کسی کے دماغ کا شعر سے مناسب ہونا اور کسی کا ریاضی سے، کسی کا دولت کمانے میں
ہوشیار ہونا اور کسی کا اس سے عاجز ہونا، حتےٰ کہ اُن مظاہر اسمار کا اپنی مدت ظہور
میں متفاوت ہونا مثلاً کسی کے ظہور کا ہزارہا سال تک دراز ہونا جیسے آفتاب و ماہتاب
اور دیگر سیارے ہیں، کسی کا چند منٹ کے بعد ختم ہو جانا مثلاً اُن جراثیم کا جو پانی اور ہوا
میں پیدا ہو ہو کر مٹتے رہتے ہیں اور اسی طرح ہم انسانوں کا مدتِ ظہور میں مختلف ہونا
یعنے کسی کا سو سال زندہ رہنا، کسی کا پیدا ہونے کے ساتھ ہی مرجانا، یہ سب بھی
اسمار و صفات ہی کا اقتضا ہے اور تقدیر الٰہی سے ہے، اسی لیے اٹل ہے۔
بہرحال یہ تو اس سوال کا جواب تھا کہ اشیاءِ عالم میں باہم صفاتی اور آثاری تفاوت
کیوں ہے؟ ظاہر ہے کہ مذہب نے جو اس کی تشریح کی ہے اس سے حق تعالےٰ پہ

Marfat.com

کوئی الزام عاید نہیں ہوتا، انسان کا کیا بگڑتا ہے اگر مٹی میں پانی کے، املی میں آم کے، اور شیر میں لومڑی کے، سانپ میں بچھو کے، اور شکر میں سنکھیا کے خواص و آثار نہیں پائے جاتے ہیں یا اگر مکھی کی عمر گدھ کی عمر کے مساوی نہیں ہوتی؟ بلکہ بقول ذوق ؎

گلہائے رنگ برنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یعنی اگر صفات کا ظہور اس شان سے نہ ہوتا بلکہ حق تعالےٰ اپنے تمام صفات کے تمام مدارج کا ظہور ایک ہی شے میں فرما دیتے تو قطع نظر اس سے کہ کائنات کے موجودہ قوانین کا نظام درہم برہم ہو جاتا، کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ یہ ان گنت چیزوں والی بے نتھاہ دنیا صرف "ایک شے" والی دنیا بن کر رہ جاتی۔ الحاصل آفاقی ہوں یا انفسی جو آثار بھی یہاں نظر آرہے ہیں۔ سب خدا ہی کے اسماء و صفات کے مظاہر ہیں اور ہر آن، ہر لمحہ رب قیوم اپنے ارادہ "کن فیکون" سے اپنے وقت پہ ان چیزوں کو ظاہر فرماتا ہے

پس ہستی کے دائرہ میں ذرہ سے آفتاب تک، شہادت سے غیب تک جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے، ہوتا رہے گا، وہ صرف اذن حق، فعلِ حق تقدیر حق سے ہو رہا ہے اور ہوگا، مذہبی مستندات اور نوشتے اسی واقعہ کی تعلیم سے معمور ہیں، اور میں نے بہ تفصیل بتایا کہ عقل و فطرت بجز اس کے اور کچھ مان بھی نہیں سکتی صوفیائے کرام کی خاص اصطلاح میں مذہب کے اسی مسئلہ کے مختلف مقامات اور منزلوں کی یافت کو توحید صفاتی، توحید آثاری، انا الحق، حقیقت محمدیہ یا کبھی فارسی زبان میں ہمہ اوست، ہمہ با اوست، ہمہ از دست وغیرہ الفاظ سے تعبیر

Marfat.com

کی گئی ہے[1] ۔۔۔ اور یوں اُن کو جو طلب حق کے ارادہ سے کھڑے ہوتے ہیں مظاہر کے علم سے ظاہر کی ذات تک، یا آثار کے علم سے موثر کے وجود کے یقین اور حضور کی اُن کو مشق کرائی جاتی ہے، علمی حد تک مذہب کے تمام اُصول و عقائد اس مسئلہ کے سمجھ لینے کے بعد روشن ہو جاتے ہیں۔

غم اور اسباب غم یا وجود شر کی توجیہ اب تک جو کچھ بتایا گیا یہ کائنات کے صفاتی تفاوت کا راز تھا، لیکن ابھی سوال کا دُوسرا رخ باقی ہے اور اُسی سے مذہب کا عملی پہلو پیدا ہوتا ہے یعنی شر کا وجود کیوں ہے؟ قرآن پاک نے متعدد مقامات پر اس کا صاف اور واضح جواب دیا ہے اُن میں سے ایک مشہور آیت یہ ہے:-

"ما اَصابَكَ من حسنةٍ فمن الله وَمَا اصابكَ من سيّئَةٍ فمن نَفْسكَ۔"

جس کا حاصل یہ ہے کہ جن چیزوں سے انسان کو راحت و سکون ملتا ہے یا اچھی معلوم ہوتی ہیں وہ خدا کی طرف سے ہیں لیکن جن چیزوں سے تکلیف و اذیت ہوتی ہے یا بُری معلوم ہوتی ہیں گو اس کا بھی خالق خدا ہی ہے لیکن اس کی

---

[1] ان کی ان ہی مختلف مقامات اور منزلوں کی توجیہ سے لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے کہ صوفی کبھی سارے عالم کو خدا کہتا ہے، کبھی انسان (انا الحق کے مظہر) کو خدا قرار دیتا ہے۔ کبھی حقیقت محمدیہ کے ناسوتی ظہور (سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا سمجھتا ہے حالانکہ اس میں جو واقعہ ہے وہ آپ جان چکے۔ ۱۲

Marfat.com

پیدائش کی وجہ خود انسان ہی ہے اور وہی اُس کا ذمہ دار ہے۔ کیسی عجیب بات ہے غم اور اسباب غم کو پیدا تو خدا کرتا ہے لیکن اُن کا ذمہ دار انسان ہے مسئلہ تقدیر کا یہی تضاد ہے جس نے مذہب کے اس عجیب وغریب دعوے کو عوام کی نگاہوں میں سخت پیچیدہ بنا دیا ہے۔

حق تعالیٰ کی ذات تو برتر ہے کسی ادنیٰ آدمی کی طرف بھی اس امر کے انتساب کی جرأت مشکل ہے، صرف یہی نہیں کہ عقل وفطرت سے یہ مسئلہ اُچٹ جاتا ہے بلکہ سچ پوچھو تو تقدیر کے جو معنیٰ عام طور پہ سمجھے جاتے ہیں اگر واقعہ بھی وہی ہے تو ساری مذہبی تحریک بے معنی ہو جاتی ہے، بلکہ اگر منصب نبوت صداقت کے تحت نہیں بلکہ کسی مصلحت کے زیر اثر ہوتا تو جس مسئلہ کو سب سے زیادہ چھپانا انبیاء کا فرض تھا وہ یہی مسئلہ ہوتا لیکن از آدم تا خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبروں نے اس مسئلہ کی تبلیغ کرکے یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف واقعات کے شارح ہیں، جو واقعہ تھا اس کا اظہار مسلسل وہ کرتے چلے آئے ہیں۔ البتہ مسئلہ چونکہ پیچیدہ تھا اس لیے عوام الناس کو تاکید کر دی گئی کہ اُس پر زیادہ غور وفکر نہ کریں اور سچی بات بھی یہی ہے کہ باوجود نہ سمجھنے کے پھر بھی اگر اکثریت پہ نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو وہ بخوبی سمجھے ہوئے ہیں، نہ صرف مسلمان بلکہ تمام مذہبی دنیا والے تقدیر کو بھی مانتے ہیں اور اسی کے ساتھ اپنے اعمال و افعال کا اپنے آپ کو ذمہ دار بھی سمجھتے ہیں گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تفصیلی طور پہ نہ سہی لیکن اجمالی طور پہ انسانی فطرت ان دونوں عقیدوں میں کوئی تضاد محسوس نہیں کرتی۔ چاہیے تو یہی تھا کہ ہم بھی اس مسئلہ میں خاموشی اختیار

Marfat.com

کرنے لیکن تکمیل درس کے لیے کچھ کہا جاتا ہے۔

فطرت انسانی کا اقتضاء اور اُس کی تقدیر

اصل یہ ہے کہ ایک طرف جہاں مذہب نے یہ بتایا ہے کہ آفاق و انفس میں جو کچھ ہے سب خدا کی مخلوق ہے اور اسی لیے یقین کیا جاتا ہے کہ یہاں کے ہر ذرّہ کی حرکت و سکون، خیر و شر براہِ راست خالق کی توجہ و التفات کے دستِ نگر ہیں، لیکن اُسی کے ساتھ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ سلسلہ تخلیق و ایجاد یا ظہورِ اسمار و صفات میں انسان کا کیا مرتبہ ہے اور پھر اس لحاظ سے تمام آفاقی کائنات کے مقابلہ میں اس کی فطرت کے اقتضاء اور تقدیر کی کیا نوعیت ہونی چاہیے؟ کہا گیا تھا اور قرآن کی رُو سے کہا گیا تھا کہ اس سلسلہ میں انسان کا مقام خلافت ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ سرچشمہ کائنات کے تمام اسمار و صفات کا مختلف مدارج کے لحاظ سے اجمالی طور پر جس حقیقت میں ظہور ہوا ہے اسی کا نام انسان ہے اور وہی تکوین و تخلیق کی آخری ارتقائی شکل ہے،
اب سوچنا چاہیے کہ اس سلسلہ میں جہاں حیات و علم اور ارادہ وغیرہ صفاتِ الٰہیہ کا ظہور انسان میں ہوا تھا اسی کے ساتھ کیا اس میں خدا کا وہ کمال نہ اُترتا جس کا نام قدرت و اختیار ہے، خدا میں جو کچھ ہے جب بالاجمال ہی سہی، سب کا عکس انسان میں آگیا ہے (اور خلافت کے یہی تو معنی ہیں)، تو انسان اس خدائی کمال کے پرتو سے کیوں محروم رہ سکتا تھا؟ پس انسان بھی اگرچہ خدا کی ایک کن فیکونی مخلوق ہے جس طرح ساری آفاقی کائنات اُس کی مخلوق ہے، لیکن منصب خلافت نے اس کی حقیقت کے اقتضاء اور تقدیر کو اسی صفت اقتدار و اختیار کی بنا پر

Marfat.com

سب سے الگ کر دیا ہے، سب کی تقدیر جبر تھی۔ اور وہی اُن میں نمایاں ہے کہ آفاق اور اُن کے آثار و خواص و افعال و وظائف کے درمیان میں کہیں انتخاب یا قوت فیصلہ کی جھلک تک نظر نہیں آتی، لیکن انسان کی تقدیر یا اُس کی حقیقت یعنی خلافت کا اقتضا اختیار تھا جو تقریباً اُس کی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے، فطرت انسانی کی یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اُس کو اُن تمام اعمال و افعال کا ذمہ دار بنا دیا ہے جن میں اس کی قوتِ انتخاب کو کسی نہ کسی حیثیت سے دخل ہو۔ ایسے لوگ جو انسانی حقیقت سے اختیار کے عنصر کا انکار کرنا چاہتے ہیں حقیقت میں خدا کی تقدیر اور اپنی فطرت کے اقتضا کو جھٹلاتے ہیں۔

رعشہ کی جنبش اور ارادی حرکت میں

فرق نہ کرنے والا دیوانہ ہے، انسان مجبور ہے یا مختار؟ ان دو پہلوؤں میں سے کسی پہلو کی ترجیح یا انتخاب خود اپنی قوتِ فیصلہ سے اختیار کا کیا اقرار نہیں ہے؟ عارف رومی نے سچ فرمایا ہے :۔

جہد حق است و دوا حق ست و درد

منکر اندر نفی جہدش جہد کرد!

واقعہ تو یہ ہے کہ عدالتی قوانین، اخلاقی آئین بلکہ حکومتوں اور سلطنتوں سب ہی کی بنیاد انسان کے اسی نمایاں امتیاز اور عنصر خاص پر قائم ہے، ورنہ درختوں پہاڑوں جانوروں اور حیوانوں پر فردِ جرم لگانے کے لیے عدالت کی کرسی کس نے بچھائی؟

بہر حال اپنے اعمال و افعال کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کا انتخاب

Marfat.com

یا ترجیح اُسی کو اختیار کہتے ہیں — اور فطرتِ انسانی میں اس کا ہونا عقلاً مشاہدۃً اور شرعاً ثابت ہے یہی اُس کا اقتضا ہے اور یہی اس کی تقدیر تھی، اسی حقیقت کی تعبیر یوں کی جاتی ہے کہ "سب کی تقدیر جبر تھی اور ہماری تقدیر ہی اختیار ہے۔"

تعلیم بالتکلیف کا اقتضاء

لیکن ابھی اُس کی تقدیر اور اقتضاء کا سلسلہ ختم نہیں ہوا، خلافت نے اُس میں اختیار پیدا کیا، یہی وہ مقام تھا جس نے انسانی پوزیشن کو نازک ترین منزل پر پہنچا دیا۔ خلافت یعنی خدا کی نمائندگی کا اقتضا یہ ہے کہ انسان اپنے اختیارات کا مالک بن کر کسی دوسرے کی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ اپنی مرضی کے مطابق انھیں استعمال کرے اور اختیار کا اقتضا ہے کہ اس کے استعمال صحیح کے لیے علم صحیح سے اس اختیار کا دامن جوڑ دیا جائے اور یوں ہر ایک انسان اپنے اختیار کی تصحیح کے لیے اپنے ناقص علوم کا نہیں بلکہ خدا کے کامل محیط علم کا محتاج ہو گیا، ملائکہ کو بھی آفرینش آدم کے موقع پر یہی جواب دیا گیا تھا کہ آدم میں حق تعالیٰ کی شاگردی اور علم حاصل کرنے کی فطری صلاحیت ہے، یعنی خدا سے علم پا کر وہ اپنے اختیار کے استعمال کی تصحیح کر سکتا ہے[1] انسانی فطرت کے اسی تعلیمی اقتضا نے اس قانون کو پیدا کیا جسے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ انسان کے خلیفہ ہونے کی خبر جب فرشتوں کو سنائی گئی تو ملائکہ نے جو یہ پیشگوئی کی کہ "یہ زمین میں فساد و خونریزی برپا کرے گا۔ بظاہر اس پیشگوئی کی وجہ یہ ہی تھی کہ الانسان جیسے جہول و ظلوم کو جب اختیار دیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ اختیار کو وہ غلط طریقہ سے استعمال کر کے فساد و فتنہ ہی برپا کرے گا (بقیہ ص ۱۴۹ پر)

Marfat.com

ہم تکلیف و تشریع کہتے ہیں جس کا ظہور انسان کی مختلف آبادیوں میں نبوت کی شکل میں ہوتا رہا ہے، یعنی ہم میں بلند ترین فطرت رکھنے والے نفوس (الرسل والانبیاء علیہم السلام) تو براہِ راست حق تعالےٰ کے شاگرد بننے اور علم پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اُن کے واسطہ سے اُن کی اُمت خدائی تعلیم کو حاصل کر کے اپنے اختیارات کے حدود کو پہچانتی اور اس پر عمل کرتی ہے۔

جذبۂ امانت پھر اُس تعلیم الٰہی کی صلاحیت پیدا کرنے ہی کا یہ اقتضا رہا کہ انسان میں امانت کا جذبہ رکھا جائے جس سے اس میں اُس کا احساس پیدا ہو کہ وہ اپنی مرضی کا نہیں، بلکہ اپنے اعمال و افعال میں اس کی مرضی کا پابند ہے جس کا یہ امین[1] ہے، اگر انسان میں امانت کا جذبہ نہ ہوتا تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جواب میں دکھایا گیا ہے کہ آدم حق تعالیٰ کی تعلیم کو قبول کر لیتا ہے، گویا یہ اشارہ تھا کہ خدا سے علم لینے کی چونکہ اس میں صلاحیت ہے اس لیے اپنے اختیار کی تصحیح یہ حق تعالےٰ کے عطا کیے ہوئے علم یعنی مذہب سے کرلے گا ۱۲۔

[1] امانت کا یہی جذبہ ہے جس کی تعبیر کبھی کانشنس (ضمیر) حاسۂ اخلاقی، احساس فرض وغیرہ مختلف الفاظ سے کی جاتی ہے، "ہمیں اپنی خواہش کی نہیں بلکہ اپنے فرض منصبی کی تعمیل کرنی چاہیے۔" انسانی فطرت کا یہ ایسا بدیہی احساس ہے کہ جو خدا کے قائل نہیں ہیں۔ وہ بھی اپنے اندر اسی مطالبہ کا پتہ دیتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے، فرض کا احساس سب کو ہوتا ہے لیکن یہ نہیں سوچتے کہ اس فرض کا عائد کرنے والا کون ہے؟ جب اپنی خواہش کی پابندی نہیں بلکہ فرض منصبی کی پابندی (باقی ص۱۵۰ پر)

Marfat.com

تعلیم الٰہی کی تلاش کا جذبہ کبھی اُس میں پیدا نہ ہوتا اور یہی مطلب ہے اس حدیث کا جس میں وارد ہوا ہے :-

"لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ"

(جس میں امانت نہیں اُس میں ایمان بھی نہیں)

قرآن میں جہاں امانت کے اُس جذبہ کا ذکر ہے وہاں بیان کیا گیا ہے کہ "اگر امانت کا جذبہ انسان میں نہ ہوتا تو وہ ظلوم و جہول بن کر رہ جاتا -" اس کا یہی مطلب ہے کہ اگر انسان کے اختیارات پر امانت کی میخ نہ ٹھونک دی جاتی تو علمی و عملی قوتوں میں اپنے اختیار کے غلط استعمال سے آدمی جاہل ہی نہیں جہول (بڑا سخت جاہل) اور ظالم ہی نہیں ظلوم (بڑا سخت ظالم) بن جاتا اور دیکھا گیا ہے کہ جذبہ امانت سے جو تھوڑا بہت کبھی ہٹے ہیں انھوں نے اپنی ظلومیت اور جہولیت کا ہمیشہ ثبوت دیا ہے آخر فلسفہ[1] اور منتھالوجی میں انسان کی جہولیت اور چنگیزیت و تیموریت / فرعونیت و رومانیت میں ظلومیت کی تصویریں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہی انسان کا فریضہ ہے تو قدرتاً اپنے سوا اس کو ڈھونڈنا چاہیے جس کے فرض کی بجا آوری کا مطالبہ ہمارا ضمیر کرتا ہے / یہی میرا مطلب ہے کہ جذبہ امانت ہی نے آدمی میں مرضی حق کی تلاش کی یہ تڑپ پیدا کی اور یہی چیز آدمی کو اُن بزرگوں کے قدموں پہ جھکاتی رہی ہے جو خدا کا پیغام لے کر بنی آدم میں آتے رہے ہیں۔

[1] واقعہ یہ ہے کہ صداقت و دیانت کی ضرورت جیسے عمل میں ہے ویسے ہی علم و تحقیق میں بھی آدمی ان امور کا ذمہ دار ہے / فلسفہ میں کیا ہوتا ہے ؟ (باقی ص۱۵۱ پہ)

Marfat.com

جو جھلک رہی ہیں کیا اُن کے تماشے کے بعد قرآن کے اس دعوے میں کوئی شک کر سکتا ہے
— الحاصل جذبہ امانت بھی فطرت انسانی ہی کا اقتضا تھا، امانت کے یہی معنی ہیں
کہ وہ اپنی مرضی کا نہیں بلکہ جس کا آئین ہے اُس کی مرضی کا پابند ہے۔

قانونِ مجازات و مکافات

اب انسانی فطرت کے اسی اقتضا نے اُس کے اختیاری اعمال و افعال اور اعتقادات و انکار کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک وہ جو خدا کی تعلیم اور اس کی مرضی کے مطابق ہیں جن کو "بِرّ" یا "بَرّ" کہتے ہیں اور اسی پر قائم رہنے کا نام عبدیت ہے۔ دوسرے وہ جو خدا کی تعلیم و مرضی کے مخالف ہیں، اسے "اثم" یا "پاپ" کہتے ہیں اور اُسی کے مختلف مدارج کا نام عصیان و کفر اور تمرد ہے اس کے بعد انسانی زندگی کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بے جانے ہوئے ان امور کے متعلق دعائی آرا قائم کیے جاتے ہیں جن کے جاننے کا صحیح ذریعہ اُن لوگوں کے پاس نہیں ہے جو عقل و حواس کے سوا اپنے پاس علم کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں رکھتے۔ منتھالوجی یعنی اقوام قدیمہ کے خرافات جنھیں دیو مالا بھی کہتے ہیں اس میں کیا کیا جاتا ہے یقیناً بغیر کسی ذمہ داری کے جو کچھ چاہا جاتا ہے مان لیا جاتا ہے اور یہی میرا مطلب ہے کہ جذبہ امانت کے اقتضا سے آدمی ہٹ کر جب سوچنے بولنے لکھنے لگتا ہے تو پھر وہ صرف جاہل ہی نہیں جہول بن جاتا ہے، یوں ہی اعمال و افعال میں جب امانت کی ذمہ داریوں کو ٹھکرا دیتا ہے تو وہ ظالم ہی نہیں بلکہ ظلوم بن جاتا ہے چنگیز، ہلاکو وغیرہ عملی خانوں ہی کی زندہ مثالیں ہیں ۱۲۔

Marfat.com

ان دونوں شعبوں کا انتفعا قدرت کا وہ قانون ہوا جسے قانون مجازات و مکافات یا نمر وجزا کا قانون کہتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ جو اپنے اختیارات کو خدا کی تعلیم و مرضی کے موافق استعمال کرے گا وہ خدا اور اس کے سارے قوانین کو اپنی مرضی اور اپنے سارے احساسات کے مطابق پائے گا، خدا کی مرضی اور انسانی مرضی کے اسی توافق کا ہی آخری عروجی مقام وہ ہے جسے مذہب کی زبان میں "الجنتہ" کہتے ہیں۔

الجنتہ جہاں انسان کو وہی دکھایا جائے گا جو وہ دیکھنا چاہتا ہے اور وہی سُنایا جائے گا جو سننا چاہتا ہے۔ قرآن نے اسی مقصد کو۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيَ انفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ط

کے الفاظ میں ادا کیا ہے، پھر مختلف جزئیات کے ذریعہ سے "الجنتہ" کے متعلق اسی اجمال کی تفصیل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ وہاں صرف خیر ہی خیر ہے شر کا نام ہی نہیں [1]

---

[1] جنتی زندگی کے متعلق ایک وسوسہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی فطرت ایک ہی چیز کی کثرت و تکرار سے اُکتا جاتی ہے، قرآن میں اسی وسوسہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے لا یبغون عنہا حولا (جنتی جنت سے الگ ہونا نہ چاہیں گے) ایسا کیوں ہوگا ؟ غالبًا اسی کے جواب کی طرف آگے اشارہ کیا گیا ہے اگلی آیت میں جس کا حاصل یہ ہے کہ کلمات رب غیر محدود ہیں اگر سمندر کو روشنائی بنا کر لکھا جائے تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے۔" میرے خیال میں یہی جنت سے عدم تحویل کی وجہ ہوگی یعنی ہر لمحہ ہر لحظہ نئی نئی کیفیتوں کے ساتھ حق تعالیٰ تجلی فرماتے رہیں گے جس کا سلسلہ ابد تک جاری رہے گا، الغرض (باقی صفحہ ۱۵۳ پر)

Marfat.com

الجنۃ کے متعلق مسیحی عقیدہ

عیسائیوں نے "الجنت" کا یہ عجیب ترجمہ کیا ہے کہ وہاں انسان اپنے تمام احساسات انسانی سے محروم کر دیا جائے گا، اسی کی تعبیر یہ ہے کہ آدمی اخروی زندگی میں فرشتہ بن جائے گا۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ عیسائیوں کی یہ جنت اعمال انسانی کی جزا ہے یا سزا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اسی وسوسہ کا جواب دیا گیا ہے :- میرے نزدیک اس آیت قرآنی "قل لوکان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا۔" میں بھی اور "کلما رزقوا منھا من ثمرۃٍ رزقاً قالوا ھٰذا الذی رُزقنا من قبلُ واتوبہ متشابھا۔" میں بھی جس کا مطلب یہ ہے کہ جب اہل جنت کو کوئی پھل دیا جائے گا تو وہ خیال کریں گے کہ یہ تو وہی ہے جو پہلے ملا تھا۔ حالانکہ یہ واقعہ نہ ہوگا معنی کے اعتبار سے ہر پھل دوسرے پھل سے بالکلیہ متغائر ہوگا اگرچہ صورۃ متشابہ یعنی ملتے جلتے ہوں گے۔ جیسے صورۃ دنیا کے پھلوں اور جنت کے پھلوں میں ممکن ہے صوری مشابہت ہو، لیکن حقیقت میں کھلا کیا اشتراک ؟ اسی حقیقت ہی کے اعتبار سے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اہل جنت کی آنکھوں کی ٹھنڈک جو جنت میں مہیا کی گئی ہے، اُسے دنیا کا کوئی شخص نہیں جانتا اسی کی شرح حدیث میں ہے کہ جنت میں نیک بندوں کے لیے ایسی چیزیں مہیا کی گئی ہیں جنھیں نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا نہ دل میں ان کا خیال گزرا ۱۲۔

Marfat.com

ضعفِ بصر کے شاکی کی اگر طبیب آنکھ نکال لے تو مریض کے ساتھ مہر ہوئی یا قہر؟ آج کل اسی مسیحی جنت کو" روحانی جنت" کہتے ہیں جو سراسر ایک عیسائی عقیدہ ہے زمانہ حال کے بعض مسلمانوں نے اس مسیحی جنت کو سائینٹفک تحقیقات کا نتیجہ سمجھ کر قرآن کی جنت کو شاعری قرار دیا[1] - عجیب بات ہے گویا خدا نے قصداً

---

[1] یہی وجہ ہے کہ قرآنی جنت کے حور و قصور اور انہار و اشجار کے ذکر سے عصرِ حاضر کے سادہ لوحوں کے دلوں میں گرانی پیدا ہو گئی ہے - گویا چاہا جاتا ہے کہ جنتی آدمی کے لیے ضروری ہے کہ نہ کھانے کی لذت اس میں باقی رہے نہ پینے کی الغرض سارے لذائذ حیات سے محروم ہو کر روحانی جنت میں داخل ہو حالانکہ جنت تو جنت، اس دنیا میں بھی تو آدمی اس بیماری کی مصیبت کو برداشت نہیں کر سکتا اور علاج و معالجہ پر مجبور ہوتا ہے باقی یہ بات کہ عیسائیوں میں یہ عقیدہ کہاں سے پیدا ہو؟ انجیل کی ایک آیت سے اُن کو مغالطہ ہوا جس میں عیسیٰ علیہ السلام نے اس یہودی کو جس نے متعدد شوہروں کی بیوی کے متعلق دریافت کیا تھا کہ ایسی عورت آخرت میں کس شوہر کو ملے گی؟ مسیح علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

"اس جہاں کے فرزندوں میں تو بیاہ شادی ہوتی ہے لیکن جو لوگ اس لائق ٹھہریں گے کہ اس جہاں کو حاصل کریں اور مردوں میں سے جی اُٹھیں - ان میں بیاہ شادی نہ ہوگی -" (لوقا - ۲۱ - ۳۵)

(باقی ص۱۵۵ پہ)

Marfat.com

غریب مسلمانوں کو اپنے طرزِ بیان سے مغالطہ میں مبتلا کر دیا ہے، امام غزالی نے سچ فرمایا ہے
مجاز و استعارہ کی اتنی زیادتی کہ سننے والے مغالطہ میں مبتلا ہو جائیں، مجاز و استعارہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مختلف انجیلوں میں یہی جواب مختلف الفاظ میں پایا جاتا ہے جس کا ظاہر مطلب تو یہی تھا کہ زن و شوہر میں جو ازدواجی تعلق یہاں قائم ہوتا ہے وہ مرنے کے بعد باقی نہیں رہتا اسی لیے بیوہ عورت دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے اس لیے یہودیوں کا وہ سوال ہی غلط تھا۔ مگر عیسائیوں کو اس فقرہ سے مغالطہ لگا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس کے بعد انجیلوں کے یہ الفاظ کہ وہ فرشتوں کے برابر ہوں گے، شراح انجیل کا اضافہ ہے یا یہ مطلب ہے کہ فرشتے باہم ایک دوسرے سے جُدا جُدا ہوتے ہیں مرنے کے بعد اُٹھنے والے بھی افراد (الگ الگ) اُٹھیں گے کسی عورت کا کوئی شوہر بن کر نہ اُٹھے گا، بہرحال کچھ بھی ہو مرنے کے بعد جینے والے انسان باقی نہیں رہتے بلکہ نیک ہوئے تو بجائے انسان ہونے کے فرشتے اور بد ہوئے تو شیطان جیسا کہ عیسائیوں کا عقیدہ ہے یا جیسا کہ تناسخ والے کہتے ہیں کہ دوسری زندگی آدمی آدمی نہیں گھوڑا ہاتھی بن جاتا ہے یہ ساری باتیں ظاہر ہے کہ سائنس یا فلسفہ سے ان کا دور کا بھی تعلق نہیں، بلکہ عیسائیوں اور ہندوؤں وغیرہ کے مذہبی عقائد ہیں، قرآن کا دعوٰی ہے کہ انسان ہر حال میں خواہ نیک ہو یا بد دوسری زندگی میں بھی انسان ہی باقی رہتا ہے نہ وہ گھوڑا بن جاتا ہے نہ ہاتھی، نہ شیطان نہ فرشتہ، نہ خدا، جیسا کہ ویدانت والے فنا فی الاصل کے نظریہ کی بنیاد پر قائل ہیں اسی لیے جنت میں ہو یا دوزخ میں انسان اپنے سارے انسانی (باقی ص۱۵۶ پر)

Marfat.com

نہیں بلکہ قصداً غلط بیانی کی ایک شکل ہے، بھلا کس کی ہمت ہے کہ قرآن والے خدا کی طرف العیاذ باللہ غلط بیانی کے منسوب کرنے کی جرأت کرے۔

النار اور جس طرح جنت، عبد و حق کی موافقت کلی کا نام ہے اسی طرح جو اپنے اختیارات کو خدا کی مرضی سے ٹکراتا ہوا امانت میں خیانت کرتے ہوئے انھیں استعمال کرتا ہے تو خدا کی مرضی بھی اس سے ٹکرانے لگتی ہے، انسان اور خدا کے ارادوں کا یہی تصادم ہے جو بالآخر بڑھتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں آدمی خدا اور اس کی ساری قوتوں اور قوانین کو اپنی مرضی اور اپنے سارے احساسات کے مخالف پائے گا مذہب کی زبان میں اُسی کا نام النار اور جہنم ہے جہاں کا ہر قانون انسان کی ہر خواہش اور اُس کے ہر احساس کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) احساسات کے ساتھ داخل ہوگا لیکن عجیب بات ہے کہ اس زمانہ کے مغرب زدہ مسلمانوں کا ایک گروہ اسی عیسائی عقیدہ کو ایک عقلی نظریہ قرار دے کر قرآن کی جنت کا مضحکہ اڑاتا ہے۔ عیسائی بیچارے تو مجبور ہیں، علاوہ انجیل کے مذکورہ بالا فقرہ کے عورتوں کے متعلق سیکڑوں سال تک اُن کو باور کرایا گیا کہ انسانی گناہ کی وہی ذمہ دار ہے، اسی لیے عورت صرف پاپ ہے نجاست ہے، غلاظت ہے بھلا اس مجسم گندگی کو حوروں کی شکل میں عیسائی ذہنیت کیسے برداشت کرسکتی ہے کہ وہ جنت میں ہوں لیکن مسلمانوں کی جنت کا پتہ جب ماں یعنی عورت کے قدم کے نیچے دیا گیا تو سمجھ میں نہیں آیا کہ پھر وہ قرآنی جنت میں حور کے تذکرہ سے کیوں گھبراتے ہیں ۱۲

Marfat.com

مخالف ہوگا اسی کو قرآن نے

کُلَّمَا اَرَادُوا اَنْ یَّخْرُجُوا مِنْهَا اُعِیْدُوا فِیْهَا

(جب بھی وہ جہنم سے نکلنا چاہیں گے اسی میں پلٹا دیے جائیں گے) کے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ اسی کے جزئی تفصیلات سے قرآن بھرا ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں شر مطلق ہے، وہاں خیر کا نام نشان نہیں۔"

یہ مسئلہ کہ جہنم کا عذاب ابدی ہے یا بالآخر ختم ہو جائے گا قرآن میں اس کا ذکر کرتے ہوئے "فعال لما یرید" رب کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی وہ جو چاہے کرے، شیخ اکبر وغیرہ کا خیال ہے کہ جہنمی اگرچہ رہیں گے تو ہمیشہ جہنم ہی میں لیکن ایک مدت کے بعد جہنم کے آباد کاروں میں بن جائیں گے، یعنی اُسی سے اُن کے مزاج کو موافقت ہو جائے گی، اس صورت میں الم اور دُکھ اُن کا شاید باقی نہ رہے لیکن ظاہر ہے کہ کچھ بھی ہو جہنم کی یہ صفت کہ وہ عذاب مہین بھی ہے یعنی جو اس میں داخل ہوں گے ذلت کی زندگی گزاریں گے۔ یہ ذلت و خواری کا طوق تو اُن کی گردن سے اُتر نہیں سکتا۔

الحاصل خلافت کا اقتضا اختیار تھا، اختیار کا اقتضا تعلیم و تکلیف، امانت و ذمہ داری تھی، اور ان سب کا اقتضاء مجازات کا اقتضاء اگر ایک طرف موافقت کلی یعنی جنت ہے تو دوسری طرف مخالفت کلی یعنی جہنم ہے اور یہی انسانی فطرت کا اقتضا اور اُس کی تقدیر تھی، اور اب قرآن کے اس بیان کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ "شر کا وجود تم سے باہر نہیں بلکہ تمہارے اندر ہے۔" اور غالباً یہی مطلب ہے آیت

Marfat.com

اِنَّ جھنّم لمحیطۃٌ بالکافرین ؎

(قطعاً جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے)

مسئلہ جبر و اختیار رہی یہ بات کہ حقیقت انسانی کے اس اختیار کی نوعیت کیا ہے؟ جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ کن فیکونی مخلوقات صرف اپنی پیدائش ہی میں نہیں بلکہ اپنی بقا میں بھی ہر لمحہ ہر لحظہ اپنے خالق قیوم کے مسلسل عمل تخلیقی کی محتاج ہیں، اور صرف وجود ہی میں نہیں بلکہ ذاتاً و صفاتاً اور فعلاً و آثاراً بھی ہر لحاظ سے کائنات کا ہر ذرہ حق تعالےٰ سے یہی نسبت رکھتا ہے۔ اور یہی نسبت خود انسان کو بھی ذات حق کے ساتھ ہے یعنی آدم بھی اپنی ذات میں اپنے صفات و کمالات اور افعال و اعمال میں ہر وقت بغیر کسی انقطاع کے رب قیوم کے عمل تخلیق کا محتاج ہے، تو ایسی صورت میں جہاں دوسرے صفات و کمالات کی تخلیق آدمی میں اسی نوعیت کے ساتھ ہو رہی ہے تو ظاہر ہے کہ اختیار و اقتدار کی صفت کا بھی یہی حال ہونا چاہیے اور یہی مذہب کا دعوےٰ بھی ہے کہ جس طرح بینائی، شنوائی وغیرہ کے صفات، حق تعالےٰ کے مسلسل عمل تخلیق سے آدمی میں پیدا ہو رہے ہیں، یہی حال انسان کی اس صفت کا بھی ہے جس کا نام اختیار و اقتدار ہے۔

پس یقیناً انسان میں اختیار پیدا ہو رہا ہے، لیکن اس اختیار کے وجود اور بقا کا سلسلہ ہر لحظہ خدا کے اختیار اور ارادہ کے ساتھ وابستہ ہے جس وقت جس طرح چاہے اپنے اس فیض تخلیقی کو وہ روک سکتا ہے اور روک لیتا ہے، قطع نظر اس مشاہدہ کے کہ انسانی اختیارات ایک خاص حد پر ختم ہو

Marfat.com

جاتے ہیں مثلاً انسان کھا سکتا ہے لیکن ہر چیز نہیں کھا سکتا، چل سکتا ہے لیکن ہر چیز پہ نہیں چل سکتا، دیکھ سکتا ہے لیکن ہر چیز کو نہیں دیکھ سکتا وقس علیٰ ہذا۔

پھر جن حدود میں یہ اپنے آپ کو مختار بھی پاتا ہے کیا ٹھیک ان ہی حدود میں بسا اوقات وہ مجبور نہیں ہو جاتا؟ پس اصل واقعہ وہی ہے کہ گو انسان میں اختیار ہے۔ لیکن اس اختیار پہ اُسے اختیار نہیں ہے، بلکہ اس کا اختیار اپنے وجود و بقا میں، تاثیر و نتیجہ میں ہر لحظہ اختیار الٰہی کے ساتھ وابستہ اور اس کی توجہ والتفات کا دستِ نگر ہے، جس وقت جس حد تک خدا اس اختیار سے چاہے انسان کو محروم کر سکتا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ پس آدمی نہ آفاقی کائنات کی طرح مجبور مطلق ہے جہاں فاعل و فعل کے درمیان قوتِ انتخابیہ کا پتہ بھی نہیں اور نہ خدا کی طرح مختار مطلق ہے کہ اس کا اختیار نہ کسی کے اختیار کے ساتھ وابستہ ہے اور نہ کوئی اس سے اُس اختیار کو سلب کر سکتا ہے بلکہ جیسا کہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ انسان کا مقام جبر و اختیار کے درمیان ہے یعنی وہ مختار بھی ہے اور مجبور بھی ہے، جب تک خدا چاہے اس اختیار کو اس میں پیدا کرتا ہے جب چاہے چھین لے، یہی مطلب ہے۔

وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ - (الآیۃ) ترجمہ:۔ نہیں چاہتے ہو تم مگر یہ کہ چاہے اللہ اور

ولو شاء اللہ لھدٰکم اجمعین

اگر اللہ چاہے تو تم سب کو سیدھی راہ پہ لگا دے۔

وغیرہ قرآنی آیتوں کا جن میں انسانی مشیت و ارادہ کو ارادۂ حق و مشیت

Marfat.com

حق ئے ساتھ وابستہ ظاہر کیا گیا ہے، حتیٰ کہ اسی بنیاد پہ پیغمبروں کے ایمانی مطالبہ پہ کافر کہا کرتے تھے ؎۔

لو شاء اللّٰہ ما اشرکنا ولا اٰباؤنا

(اگر خدا چاہتا تو ہم اور ہمارے آبا و اجداد شرک نہ کرتے)

یہ سچ ہے کہ انسانی اختیار کا یہی حال ہے یعنی اختیار کو چھین کر اگر حق تعالےٰ چاہیں تو لوگوں کو بجائے شرک کے توحید پہ مجبور کر سکتے ہیں، لیکن اس مطالبہ کے پھر یہ معنی ہوں گے، کہ مختار انسان کو مجبور کر دیا جائے بالفاظ دیگر انسان سے انسانیت یعنی خلیفہ سے خلافت چھین لی جائے جو نہ خدا کی صفات کا اقتضا ہے اور نہ فطرتِ انسانی کا آخر ہم ہیں کون ہے۔ جو سور یا بندر یا بننے کے لیے تیار ہے مٹی بننے سے لوگ کیوں گھبراتے ہیں۔ یعنی مرکر قبر میں جانا نہیں چاہتے، یہی بات ہے کہ مختار انسان ان صورتوں میں مجبور بن جاتا ہے، اور اس کا مقام عالی اُس سے چھن جاتا ہے جسے اُس کی فطرت برداشت نہیں کر سکتی۔

بہرحال ان آیتوں سے یہ سمجھنا کہ خدا ہی نے انسان کو کفر و فسق پہ مجبور کر دیا فلسفۂ تخلیق اور فطرتِ انسانی سے جہالت کا نتیجہ ہے اور بات بھی یہی ہے کہ وہ

؎ چونکہ خدا نے آدمی کو مثلاً توحید پہ مجبور نہیں کیا۔ اس کا یہ مطلب کیسے لیا جا سکتا ہے کہ اس نے شرک و کفر پہ مجبور کیا بلکہ واقعہ وہی ہے کہ توحید پہ چاہتا تو آدمی کو خدا مجبور کر سکتا تھا لیکن اس وقت آدمی خلیفہ نہیں بلکہ منجملہ آفاقی کائنات کی ہستیوں کے ایک مجبور ہستی بن جاتا خلافت کے مقام پہ اسی وقت تک رہ سکتا ہے جب تک کہ شرک و توحید میں مثلاً انتخاب کا موقع اس کے لیے باقی رہے (۱۲)

Marfat.com

(انسان)، اور اُس کے تمام کمالات وصفات، حتیٰ کہ اس کا اقتدار و اختیار الغرض فعل و فاعل، اس کا اوّل و آخر اور وسط کے تمام اسباب و قوانین سبب کے سب ربّ قیوم کے مسلسل غیر منقطع عمل تخلیق سے ہی پیدا ہو رہے ہیں اور اپنی بقا و وجود میں بھی ربِ قیوم ہی کی نظر التفات کے دستِ نگر ہیں تاہم اسباب و علل کے سلسلہ میں کسی نہ کسی جگہ وہ چیز بھی ضرور چھُپی ہوئی ہے جس کا نام اختیار اور قوتِ فیصلہ و انتخاب ہے اور جو ہمیں تمام آفاقی کائنات سے ممتاز کرتی ہے اسی نے انسان کی ذمہ داری کے دامن کو تھاما اور مجازات کے قانون کو پیدا کر کے "شر" کی آگ بھڑکائی، اعمال و افعال انسانی کے اسی اختساب کا نام کسب رکھا گیا ہے، اسی لیے کہتے ہیں کہ انسانی اعمال و افعال اس کے سارے اسباب و نتائج کا خالق تو خدا ہے لیکن ان سب کا انسان ہے اور یہی مطلب ہے قرآنی آیت

واللہ خلقکم وما تعملون

(اللہ نے پیدا کیا تم کو اور اُس کو جو تم کرتے ہو)

مقصد تخلیق یا ابتلا یا لعبدیت

فطرت انسانی کا یہی جبر نما اختیار ہے جو بالآخر آدمی کو اس مقصد تک خود پہنچا دیتا ہے جس کے لیے وہ پیدا ہوا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو تمام آفاقی کائنات کے مقابلہ میں اختیار اور اُس کی وسعت کے امکانات کا احساس ہم میں آرزوؤں اور تمناؤں کے طوفان برپا کرتا رہتا ہے، اور دوسری طرف ہمارے محدود اختیارات، ہماری نارسائیاں اور تمناؤں کی شکست اور ناکامیاں مجبور کرتی ہیں کہ غریب انسان اپنی ذلت کی پیشانی کسی کے آگے جھکا دے اور

Marfat.com

سوال یا بھیک کا ہاتھ کسی کی طرف اٹھائے، اسی کو عبادت اور دعا کہتے ہیں اسی کی مختلف شکلوں اور ہیئتوں کا نام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہے۔ کس کے آگے جھکے! کس سے مانگے؟ بلاشبہ اس میں بنی آدم کے مختلف طبقات رہے ہیں لیکن نفس کے جھکنے اور مانگنے سے تو عموماً کسی نے انکار نہیں کیا اور یوں یہ اہم سوال کہ "عالم کو خدا نے کس لیے پیدا کیا؟" اس سوال کا زندہ جواب بن کر وہی ہستی سامنے آجاتی ہے جو خلافت کے قالب میں خدائی کمالات لے کر پیدا ہوئی تھی اور اب بندہ بن کر زندگی گزارنے پر مجبور ہے خلافت اور عبدیت کی یہی کشمکش ہے جس نے انسان کی اس ارضی زندگی کو آزمائش اور ابتلاء کی زندگی بنادی ہے۔ الغرض اب جا کر فطرت انسانی کی پیچ در پیچ قوانین نے

مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ۝

(نہیں پیدا کیا میں نے الجن اور الانس کو مگر اسی لیے کہ وہ میری عبادت کے لیے چلے جائیں)

کی تفسیر کر دی، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس کن فیکونی کائنات کا ہر ذرہ رب قیوم کے جب مسلسل عمل تخلیق اور التفات و توجہ کا محتاج اور دست نگر ہے تو اس میں یہ مختار نما مجبور انسان اگر کچھ کر سکتا ہے تو صرف یہی کہ اپنے اختیارات کو بجائے ناقص علوم اور ناقص تجربوں کے علم محیط کلی کے ماتحت کر دے یعنی خدا کے بنائے ہوئے قانون کو اپنے اوپر عائد کر لے اور خود

ایاک نعبد و ایاک نستعین (ترجمہ) تجھی کو ہم پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں، کہتے ہوئے اس کے آگے جھک جائے جس کے سامنے جھکنے کے لیے وہ پیدا

Marfat.com

ہوا ہے، اسی سے ہر معاملہ میں صراط مستقیم کا طلب گار ہو جس کے اختیار میں سب کچھ ہے وہ اسی لیے پیدا ہوا ہے اور وہ سوچے تو اس کے سوا وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا، بلکہ جیسا کہ بتایا گیا تھا[1] کہ انسان اپنے وجود کا مقصد اس (عبدیت) کے سوا کچھ نہیں بنا سکتا، عبدیت کے مقام سے ہٹ جانے کے بعد معلوم ہو چکا ہے کہ انسان پھر کسی مقام پہ ٹھہر کر اپنی ہستی کو کارآمد اور نظام کائنات کا مفید جز ثابت نہیں

---

[1] اشارہ سیرت کے مقدماتی اسباق کی طرف ہے جن میں بتایا جاتا تھا کہ کائناتی موجودات مثلاً ہوا، پانی، آگ، خاک، نباتات، جمادات جس سے بھی پوچھا جائے اپنے وجود کا کوئی نہ کوئی مفاد بتائیں گے یعنی کسی نہ کسی طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ وہ انسان کے کام آتی ہیں، آخر دنیا سے اگر ہوا نکالی جائے، پانی خشک ہو جائے تو کیا آدمی زمین کے اس کرہ پہ زندہ رہ سکتا ہے؟ لیکن عجیب بات ہے کہ جب اسی سوال کو انسان کی طرف عاید کیا جاتا ہے یعنی پوچھا جاتا ہے کہ اس کا وجود دنیا کی کس چیز کے کام آتا ہے؟ تو اس کا کوئی جواب نہیں ہے سوچنا چاہیے کہ بنی آدم کے ایک ایک فرد کو چن چن کر اگر معدوم کر دیا جائے ان چھوٹوں بڑوں میں سے کوئی یہاں باقی نہ رہے تو ہوا کا، پانی کا، آفتاب کا، ماہتاب کا کیا بگڑے گا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی معمولی تنکے اور کسی ریزہ کا بھی کوئی نقصان نہیں اگر یہاں آدمی نہ ہو، پھر کیا سلسلہ کائنات میں بے مقصد اور تحصیل لاحاصل وجود انسان ہی کا ہے "الدین القیم" کے حصہ دوم میں اس مسئلہ کی پوری تفصیل انشاء اللہ آئے گی۔

Marfat.com

کر سکتا۔ اس کے بعد وہ قطعاً سُدیٰ (یعنی معطل) اور عبث بن کر رہ جاتا ہے جس کی طرف قرآنی آیات

(۱) اَفَحَسِبْتُمْ اِنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا ؟

کیا آدمی یہ سوچتا ہے کہ اُسے لاحاصل بنا کر ہم نے پیدا کیا ہے ؟

(۲) اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ۔

کیا آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ بے نتیجہ بنا کر چھوڑا جائے گا ؟ میں اشارہ کیا گیا ہے

تدبیر کے حدود

لیکن یہ طرز عمل ان ہی افعال و اعمال کے ساتھ ممکن ہے جن کے متعلق علم محیط یعنی مذہب نے نفی یا اثبات میں احکام بھی نافذ کیے ہوں مثلاً فرائض و واجبات اور حرام و مکروہ وغیرہ میں بجائے اپنی مرضی کے اُن کو مرضی حق کے تابع کر سکتا ہے لیکن اعمال و افعال کا وہ حصہ جس میں انسان کو آزادی دی گئی ہے جسے مناجات کہتے ہیں اس میں وہ کیا کرے ؟ ظاہر ہے کہ جس میں اُسے آزاد چھوڑا گیا ہے اُس میں اُسے آزادی ہی ہوگی، لیکن اُس کے اختیار کی قدرتی مجبوریاں چاہتی ہیں کہ یہاں بھی وہ اپنے ناقص اختیار اور ناقص علم کے ساتھ ساتھ کامل علم اور کامل اختیار کا طالب ہو، اور یہی وہ فطری ضرورت ہے جس کی تکمیل مذہب نے تسمیہ[۱] استعانت، استخارہ اور توکل تفویض دعا وغیرہ ذرائع سے کی ہے۔ اور وہ جو ان چیزوں سے بے اعتنائی

---

[۱] تسمیہ یعنی بسم اللہ کر کے کام شروع کرنا، استعانت یعنی حق تعالیٰ سے ہر کام میں اعانت چاہنا استخارہ یعنی ایسے معاملات جن کے دونوں پہلوؤں میں (باقی ص ۱۶۵

Marfat.com

برت کر اُن کا اڑاتا ہوا صرف اپنے ناقص علم اور ناقص تجربات اور محدود اختیارات پر اعتماد کر کے کائنات کے اس پُرپیچ قوانین والے سمندر میں پھاندتا ہے جس کے ہر ہر موج میں حلقہ صدم کا نہنگ[1] پوشیدہ ہیں کون کہہ سکتا ہے کہ اُس بیچارے کی کے اُن خندقوں میں کیا گزرے گی اور اُس کے مقاصد کے قطروں کو موتی بننا کب نصیب ہوگا انسان کے ناقص علم و اختیار کا سرمایہ تو بس اسی قدر ہے آگے قادر قیوم کو اختیار ہے چاہے اُس شخص پر فطرت کے اُن پیچیدہ قوانین کا علم ظاہر کرتے ہوئے اُس کے اختیار میں وسعت پیدا فرما دے اور نتیجہ تک پہنچا دے، عموماً قدرت کا یہ برتاؤ اُن ہی سرکشوں کے ساتھ ہوتا ہے جن کی بصیرت کی آنکھیں پھوڑنا چاہتا ہے اور غفلت کی ٹوپی پہنا کر اُنھیں سزا کی پھانسی دینا چاہتا ہے، قرآن کی اصطلاح

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) عقل ترجیح نہ دے سکتی ہو، یا دل مطمئن نہ ہوتا ہو، حق تعالیٰ سے چاہنا کہ جو ان پہلوؤں میں بہتر ہو، اُسی کو آسان فرمایا جائے ایک خاص نماز بھی استخارہ کے لیے اسلام میں مقصد ہے۔ باقی توکل و تفویض و دعا کو سب ہی جانتے ہیں۔ ۱۲

[1] (حاشیہ صفحہ ہذا) غالب کا شعر ہے ؎

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

میں کائنات کے ان ہی پُرپیچ قوانین کو ایک بلیغ تشبیہ کے ساتھ سمجھایا گیا ہے اس فقرہ میں اسی کی طرف تلمیح ہے۔ ۱۲

Marfat.com

ہیں اس کا نام "تمیز" و "املا" ہے اور جہاں یہ ممکن ہے وہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علم و اختیار کے جس نقطہ پر چاہے انسان کو اللہ تعالیٰ روک دے اور روک دیا ہے بخلاف ان لوگوں کے جو توکل، استخارہ اور دعاء وغیرہ کی روشنی میں چلتے ہیں، وہ ناقص علم کو کامل علم اور محدود اختیارات کو غیر محدود اختیارات کے ساتھ جوڑ کر چلتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا اپنے مقصد تک پہنچنا یقینی اور قطعی ہے اور یہی مطلب ہے قرآن کی آیت

"وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔" کا

یعنی جس نے خدا پر بھروسہ کیا پس اللہ اس کے لیے بس ہو جاتا ہے بہرحال انسان کے ناقص علوم و تجربات کے مشوروں کا نام تدبیر ہے جو اس ناقص کا رشتہ کامل سے جوڑ کر چلتا ہے اس کی کامیابی قطعی ہے اور جو ایسا نہیں کرتا اس کی کامیابی کا کوئی ذمہ دار نہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کامیابی کے لیے تدبیر کے کرنے یا نہ کرنے میں تو انسان آزاد ہے جس حد تک تدبیری مشوروں کو چاہے نہ مانے دعا و توکل اور اعتماد علی اللہ سے کسی حال میں اسے چارہ نہیں، اسی لیے بعض خواص کبھی کبھی تدبیروں سے الگ ہو کر زندگی کے جہاز کو توکل ہی پر چھوڑ کر اپنی کامیابیاں دکھلا کر یہ بتلا دیتے ہیں کہ کامیابی کی اصل شرط کیا ہے۔

پس توکل کرنے والا اسباب کو چھوڑتا نہیں، بلکہ ناقص اور کھوکھلے اسباب کو چھوڑ کر کامل سبب یعنی علم محیط اور اختیار مطلق کو اختیار کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس سے بڑی دانشمندی اور کیا ہو سکتی ہے۔

دنیاوی مصائب اور اس کے اسباب | میں بتا چکا ہوں کہ اصولاً حزن و غم

Marfat.com

یا نتیجہ قانونِ مجازات کا اقتضا رہیں اور قانون مجازات کا اصلی مظہر انسانی تنزل کا وہ مقام ہے جہاں مرکزی قوت کی مخالفت جہنم کے بھیس میں انسان کے سامنے نمودار ہو گی، لیکن افراد و اقوام کے اختیار کی مطلق العنانیاں کبھی کبھی مرضِ حق سے اس قدر زیادہ اور اتنی شدت کے ساتھ متصادم ہونے لگتی ہیں کہ اس تصادم کا جو شرارہ کل جہنم میں بھڑکنے والا تھا وہ آج ہی بڑھتے ہوئے اسی زندگی کے دامن کو تھام لیتا ہے اور وہی مصائب کی صورت میں لپٹ جاتے ہیں خصوصاً قومی تباہیاں جب کبھی اس عالم میں آئی ہیں ہمیشہ اسی قانون کے تحت اُن کی پیدائش ہوئی ہے۔ طوفانِ نوح ریح عاد صیحہ، ثمود گزشتہ اُمتوں میں یاجوجیت اور دجالیت وغیرہ فتن کا ظہور خاتم الامم میں اسی کے نتائج ہیں۔

اسی طرح افراد کے مصائب بھی گو زیادہ تر مجازات ہی کے نتائج ہیں، خصوصاً باطنی آفتیں مثلاً جذبۂ امانت کی موت، اور انسانی احساسات سے محرومی، جسے قرآن کی اصطلاح میں ختم قلوب غشاوہ تسلیط شیطان اضلال اغوا وغیرہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، لیکن کبھی کبھی اس کے اسباب اور بھی ہوتے ہیں مثلاً بعض بلند ہمت نفوس اپنے ابناء جنس کے مصیبت زدہ افراد کی تسلی کے لیے قصداً ایسے حال میں رہتے ہیں جسے ہم مصیبت کہتے ہیں۔ حالانکہ اُن لوگوں کی یہ مصیبتیں اضطراری نہیں بلکہ اختیاری ہوتی ہیں[1] کبھی کسی کی لذت ایمان، یقین و صبر اور عشق و محبت

---

[1] حضرت امام مالکؒ کی صحیح حدیث ہے ان مصائبی تعزی المسلمین فی مصائبھم (یعنی میری مصیبتیں مسلمانوں کی تسلی و تعزیت ان کی مصیبتوں میں

(باقی ص۱۶۸ پر)

Marfat.com

کے اعلیٰ جذبات کا مظاہرہ ان مصائب کی روشنی میں کیا جاتا ہے تو ایسے مصائب سے صاحبِ مصیبت کی تذلیل نہیں بلکہ اُن کی عظمت و جلال کا مظاہرہ ہوتا ہے، نیز جیسا کہ عرض کیا گیا تقریبًا ان مصائب کا اکثر حصہ اختیاریؔ ہی ہوتا ہے، اور کبھی اُن ہی صفات کو سچوں میں مستحکم کرنے اور منافقوں کو اُن کی جماعت سے جدا کرنے کے لیے کبھی ایسا کیا جاتا ہے۔

قانونِ تحویل و تخفیف کبھی مجازات کے وہ خوفناک نتائج جن کا ظہور آئندہ زندگی میں ہونے والا تھا، توبہ و استغفار کے قوانین کے تحت (جن کا ذکر آگے آئے گا) اُن ہی کو نرم اور ہلکا کرکے دنیوی مصائب کے اندر بدل دیا جاتا ہے، گویا جو قانونًا مستحق قتل و قصاص مثلاً تھے انھیں چند تازیانے مار کر خلاصی بخشی جاتی ہے۔ سلسلۂ مصائب میں اسی قانون کا نام تخفیف و تحویل ہے اور اُن ہی مصائب کو گناہ کا کفارہ خیال کیا جاتا ہے۔

قناعت و زہد ان سب کے علاوہ بنیادی مصائب کا ایک بہت بڑا حصہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کرتی رہیں گی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے اور فقر و فاقہ کی اس زندگی کی یہ بھی ایک توجیہ ہے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باختیار خود پسند فرمایا تھا ورنہ آپ کو کہا گیا تھا کہ "نبی ملک" (بادشاہ) ہو کر رہنا چاہتے ہو تو یہ بھی ہو سکتا ہے علیٰ ہذا اُحد پہاڑ کے سونا بننے یا ارض بطحا کو سونا بنا دینے کی خواہش بھی آپ سے کی گئی اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے سب سے انکار فرمایا تو اس کا ایک راز یہ بھی ہو سکتا ہے ۱۲۔

Marfat.com

وہ بھی ہے۔ جیسے حماقت یا غفلت کی سزا میں مبتلا ہونے والے عموماً مصیبت خیال کرتے ہیں لیکن خود جس پر وہ "مصیبت" ہوتی ہے اسی میں وہ اپنی راحت محسوس کرتا ہے مثلاً حاجتوں کا اختصار اور وہ راز کار باتوں سے احتراز، ترک مالایعنی (غیر ضروری امور سے اعراض) قدر ضرورت پر کفایت ان باتوں کو غافلوں کی سزا یافتہ جماعت جہنم خیال کرتے ہیں، واقعہ فیصلہ کرے گا کہ سچ کس کے ساتھ ہے الحاصل یہ "مصائب" تو ہوتے ہیں لیکن وہ "سیئہ" نہیں ہوتے۔

دنیا کی متعدی سزا اسی سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ بعض شدید جرائم جن کی سزا کا زور اسی زندگی (الحیوۃ الدنیا) کے گریبان کو چاک کر کے ظاہر ہو جاتا ہے کبھی وہ ایسے سخت ہوتے ہیں کہ ان کی سزا بھی سزا پانے والے کے لیے جرم بن جاتی ہے مثلاً خونی قتل کر کے قتل پر اور جری ہو جاتا ہے تو اس کے قلب کی یہ کیفیت خون کرنے کی باطنی سزا ہے لیکن خود یہ سزا مستقل جرم اور آئندہ جرائم کا مقدمہ ہے قریب قریب تمام باطنی سزاؤں کا یہی حال ہے۔

اسی قسم کے جرائم وہ بھی ہیں جن کی سزا سے دنیا میں کبھی کبھی وہ بھی متاثر ہو جاتے ہیں جو مجرم نہ تھے مثلاً فرض کیجیے کہ کسی شہر کے باشندوں پر زنا کا بھوت سوار ہوا، رفتہ رفتہ اس کی کثرت اس سزا کو پیدا کرتی ہے جس کا نام وبا ہے، اس وبا سے غیر زانیوں کی اگر وہ جماعت بھی متاثر ہوئی جو اس فعل شنیع سے نہ صرف علیحدہ تھی بلکہ روکنے کی کوشش بھی کرتی تھی تو اس کے ذمہ دار زانی ہی ہوں گے اُن کو مجازات کے اصل مقام (جہنم) میں نہ صرف زنا ہی کی باقی سزا بلکہ دوسرے

Marfat.com

غیر زانیوں کو وبا میں مبتلا کرنے کی سزا بھی بھگتنی ہو گی، اور یہی حال اُن آباؤ اجداد کا ہو گا جن کی بداعمالیوں اور سیہ کاریوں کے نتائج اُن سے منتقل ہو کر ان کی نسلوں اور بچوں میں پھیل جاتے ہیں[1] گویا اپنی آئندہ نسلوں پہ ظلم توڑنے والا اور اُن کو اذیت پہنچانے والا بھی مجرم ہوتا ہے حتیٰ کہ جانوروں تک میں یہ قانون عام ہے[2]

---

[1] تناسخ جو بالکلیہ ایک غیر عقلی دعوےٰ ہے اس کے ثبوت میں بہ مشکل اگر کسی چیز کو بطور مغالطہ کے پیش کیا جاتا ہے وہ یہی بچوں کی بیماریاں وغیرہ ہیں، کہا جاتا ہے کہ وہ مکلف تو تھے نہیں پھر اُن کے مصائب کی توجیہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ پچھلی زندگی کے اعمال کی سزا اُن مصائب کو قرار دیا جائے لیکن جب بچوں وغیرہ کے اُن مصائب کی علت اُن کے باپ دادوں کے جرائم بھی ہو سکتے ہیں، تو تناسخ والوں کی یہ دلیل بھی بے معنی ہو جاتی ہے، آخر یوں بھی ایک شخص دوسرے پر جیسے ظلم کرتا ہے کیوں نہیں سمجھا جائے کہ پہلی نسلوں کے افراد اپنی بداعمالیوں سے خود اپنی پچھلی نسلوں پہ ظلم کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تو اس معاملہ میں کہ ایک شخص کسی کی آنکھ پھوڑ دے اس میں اور اس معاملہ میں زناکاری وغیرہ کے جرائم میں مبتلا ہو کر کسی کا دادا مثلاً آتشک میں مبتلا ہوتا ہے اور آتشک کی وجہ سے اس کا بیٹا یا اس کا پوتا بھی اسی بیماری کو لے کر پیدا ہوتا ہے تو میرے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے سمجھا جائے گا کہ اس پوتے یا بیٹے کو اس کے دادا یا باپ نے اس مرض میں مبتلا کر کے اس پہ ظلم کیا ہے جس کی سزا باپ اور دادا کو بھگتنی پڑے گی الحاصل بچوں کے امراض وغیرہ تناسخ کی دلیل قرار دینا بھی ایک دعوے سے

Marfat.com

غم سے نجات کی راہ یا تسلیم و رضا توبہ و استغفار

غم یا شر کی پیدا کرنے والی جب وہ قوت ہے جس سے اوپر کوئی قوت نہیں ہے تو کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان کے لیے ایسی صورت میں سب سے پہلا کام مصیبت زدہ ہونے کے بعد تسلیم و رضا ہی کا ہو سکتا ہے یا پھر خدا سے خدا ہی کی طرف پناہ ڈھونڈھنے کے لیے بھاگے، خصوصاً جب دنیاوی غم بھی عموماً قانون مجازات ہی کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی مرضی حق سے انسانی مرضی کے ٹکرانے یا مقام عبدیت سے ہٹنے ہی کا جب یہ خمیازہ ہے تو اس کا حقیقی علاج بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان پلٹ کر پھر اسی نقطہ تک آجائے جہاں سے وہ بھاگ کر غم میں مبتلا ہوا تھا، اسی حرکت بازگشت یا باطنی گردش کا نام توبہ ہے یعنی جس سے ٹکرایا ہے اسی سے رحم و مغفرت کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) زیادہ کچھ نہیں ہے اور لے دے کر تناسخ کے ثبوت کی یہی آخری دلیل تھی خصوصاً طبی تحقیقات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچوں وغیرہ کے یہ امراض عموماً توارث کے نتائج ہوتے ہیں۔ ۱۲

سلہ مطلب یہ ہے کہ تجربہ مشاہدہ بتاتا ہے کہ حیوانات میں عموماً امراض وغیرہ میں وہی مبتلا ہوتے ہیں جو انسی کہلاتے ہیں مثلاً گھوڑے، بیل، مرغیوں کو عموماً دیکھا جاتا ہے کہ بیماریوں کی شکار ہوتی ہیں ورنہ وحشی جانور اور پرندوں کو بیمار ہوتے ہوئے کسی نے دیکھا ہے؟ ارباب کشف کا بیان ہے کہ انسی جانوروں میں یہ چیزیں انسانی اعمال ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔ ۱۲

Marfat.com

درخواست کرے اسی کو استغفار کہتے ہیں، بدی کے بدلے نیکی کرے، صدقہ دے، روزے رکھے، نمازیں پڑھے کہ یہ سب چیزیں کفارہ بن جاتی ہیں۔

مسئلہ شفاعت

اسی معالجہ کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ غم زدہ انسان اپنے اندر اس صلاحیت اور کیفیت کو پیدا کرے کہ دوسرے خاصانِ حق بھی اس کے لیے دعا کریں یعنی جن باتوں سے وہ بزرگ خوش ہوں حتی الوسع اُن پر کاربند ہو اسی کو شفاعت کہتے ہیں حق تعالیٰ سے گنہ گاروں پر رحم کرنے کی دعا کرنا، آخر شفاعت کے معنی اُس کے سوا اور کیا ہیں؟ بہرحال غم کے علاج و معالجہ کی صورتیں عقل بھی یہی سوچ سکتی تھی اور مذہب نے بھی ان ہی کا اعلان کیا ہے۔

مسئلہ شفاعت کے متعلق غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ جس طرح وہ خود دوسروں کی خوشامدوں اور منتوں سے خوش ہوتے ہیں بزرگوں کا بھی یہی حال ہے حالانکہ جن کی سب سے بڑی خوشی یہ ہو کہ دوسرے بھی خدا کے اُسی طرح بندے بن جائیں جیسے ہم ہیں کیا وہ ایسے شخص سے خوش ہو سکتے ہیں جو بجائے خدا کی بندگی کے خود ان کی پرستش کرنے لگے؟ یہی وجہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ کی شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے تو فرمایا جس نے دل سے لا الٰہ الا اللہ کہا، یعنی کم از کم عقیدہ توحید سے وہ آپ کو خوش رکھے تو آئندہ عملی کمزوریوں کے متعلق دعا اور شفاعت سے کچھ کام چل سکتا ہے، لیکن کیا کیجیے کہ احمقوں کا گروہ بزرگوں اور اللہ کے نیک بندوں کو اپنے اوپر قیاس کر کے قریب قریب اُن سے وہ تعلق رکھنا چاہتا ہے جو بندے اور خدا میں ہونا چاہیے۔ سمجھتا ہے کہ اس کے

Marfat.com

اس طریقۂ کار سے بزرگوں کی خوشنودگی حاصل ہوگی حالانکہ اگر بصیرت کی آنکھ اُن کے اندر ہوتی تو وہ دیکھ سکتے کہ اپنے جن اعمال و افعال سے وہ بزرگوں کی دعاؤں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، دراصل وہ اُن کے لیے وبال بن رہے ہیں، بجائے رحمت کے اپنے اُن ہی اعمال کی بدولت وہ اللہ کے اُن نیک بندوں کی لعنتوں کا اپنے کو سزاوار بنا رہے ہیں۔

بہرحال یہاں تک تو انسانی اقتضاأت ہیں، اب تک قدرت کی طرف سے جو کچھ ہوا وہ اُس کے ان اقتضاأت کا جواب تھا، اقتضاأت کے اسی سلسلہ کا نام "سعی" ہے اور یہی شرح ہے آیت

لیس للانسان الا ما سعیٰ کی

یعنی فطرت انسانی جس چیز کی اپنے اقتضائے مستحق ہوسکتی تھی وہ تو یہی ہے

رحمت کاملہ الٰہیہ کے اقتضاءات

لیکن ابھی اس ذات کا اقتضا باقی ہے جس پر انتقام سے زیادہ عفو، غضب سے زیادہ لازم اور جلال سے زیادہ جمال غالب ہے جو پہلے رحمٰن پھر رحیم، تب تیسری دفعہ "بدلہ کے دن کے مالک" ہونے کا اعلان کرتا ہے، جس کے کھلانے کے دن بھوکے مارنے کے دنوں سے جس کے خطاکار بندوں کی راحت کے دن مصیبت کے دنوں سے، جس کے میر ہی نہیں بلکہ غریب بندوں کی خوشی کے اوقات بھی غم کی گھڑیوں سے زیادہ ہیں" جس کی رحمت ہر چیز میں سمائی ہوئی ہے اور جس کا رحم غضب پر سابق ہوچکا ہے تو اس ذات کا اقتضار باقی ہے چشمۂ کائنات کی

Marfat.com

یہی وہ خصوصیت ہے جس نے بدی کی سزا صرف ایک بدی رکھی ہے اور نیکیوں کے معاوضے کو دس گناہ بلکہ اُس سے بھی زیادہ کر دیا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ خالق کائنات کی اسی خصوصیت کے وہ نتائج بھی ہیں جن کی مذہب نے تفصیل کی ہے جس کے سمجھنے کے لیے اجمال کے طریقہ کو ترک کرنا پڑے گا۔

عبدیت کا کلی دستور اور اس کے نتائج

مطلب یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں خالق تعالیٰ جل مجدہ کے مرضیات اور اس کی ہدایتوں کی رہنمائی و اطاعت کو جو اپنے وجود کا آخری اور واحد نصب العین یقین کرتے ہوئے خدائی احکام اور مرضیات کے مقابلہ میں ہر قسم کے غیر خدائی آداء اور مشوروں سے آزادی اور کنارہ کشی کو ایک محتم اور نہ بدلنے والے فیصلہ کی صورت میں قبول کر چکا ہے، یعنی انبیاء علیہ السلام کے کلمۂ دعوت " لاالہ الا اللہ" پہ ایمان لا کر ہر چھوٹی بڑی مخلوق کے الٰہ ہونے کا قطعی طور پہ انکار کرتے ہوئے صرف اللہ ہی کو اپنا الٰہ بنا چکا ہے، اپنی تمام حاجتوں اپنے نسک، اپنی صلاۃ کا مرجع سارے جہان کے پالنے والے " اللہ رب العالمین" ہی کو یقین کرتا ہے اور اسی پہ جینا اسی پہ مرنا چاہتا ہے، اسی کی اجمالی تعبیر یہ ہے کہ عبدیت کے کلی دستور کے آگے سر تسلیم وہ خم کر چکا ہے۔

تو میں اس قسم کے آدمی کے متعلق یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کے ایمان کے بعد اگر جزئیات اور تفصیلات میں عملاً کبھی کبھی اس کی مرضی، حق کی مرضی سے متصادم ہو جاتی ہے اگر قانون مجازات کی رُو سے وہ مستحق سزا ضرور ہے لیکن جس کا رحم اس کے غضب سے آگے بڑھ جاتا ہے، اگر وہی مجازات کے اُن نتائج سے اس کو

Marfat.com

بچالے، تو پیغمبروں نے ماں کی ممتا اور باپ کی محبت سے بھی زیادہ چاہنے والے جس ارحم الراحمین کو باور کرایا ہے، رحم سے بھری ہوئی اُس ذات کے ساتھ اگر یہ حسن ظن قائم کیا جائے تو مذہب نے اُس حسنِ ظن کی حوصلہ افزائی کی ہے بلکہ قرآن کی مشہور آیت

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ

قطعاً خدا نہ بخشے گا اس امر کو کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور بخش دے گا اس کے سوا (یعنی شرک کے ماسوا) جس کے لیے چاہے گا۔

کا جو مفاد ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو خدا کی مرضیات کی اطاعت اور اس کی بندگی کو صرف اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھتا بلکہ دوسروں کو بھی اس میں شریک قرار دیتا ہے، یعنی وہی بات کہ عبدیت کے کلی دستور کو اپنے وجود کا نصب العین نہیں ٹھہراتا اور حق کے سوا دوسرے کو بھی الٰہ بناتا ہے، قرآن کی رو سے قانون کی رو سے ایسا آدمی کسی طرح بچ نہیں سکتا کہ وہ بغاوت کلّی کا مرتکب ہے، حق تعالیٰ کی حکومت میں رہنے والے بندوں پہ خدا کے سوا غیر خدا کے قانون کو نافذ کرتا ہے اور غیر خدا کی اطاعت وعبادت کا ارتکاب کر رہا ہے اور یہی مطلب ہے۔

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ۔

یعنی خدا نہیں بخشتا اس کو جو اُس کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے۔

لیکن عبدیت کے کلّی دستور پہ جس کا ایمان ہے اور اللہ ہی کو جو اپنا الٰہ دل سے بغیر کسی تذبذب اور شک کے مان چکا ہے لیکن باوجود اس کے اس دستور کے جزئی دفعات سے اس کی زندگی کا کوئی عملی رُخ کبھی متصادم ہو جاتا ہے تو چونکہ کلّی بغاوت کے نہ مٹنے والے داغ سے اس کا دامن پاک ہے اس لیے مذکورہ

Marfat.com

بالا آیت میں اعلان کیا گیا ہے کہ خدا چاہے تو قانون مجازات سے اس مجرم کے جرم کو مستثنیٰ فرما دے بہرحال وہ باغی نہیں مجرم ہی ہے بغاوت کا نہیں صرف خطا و قصور کا مرتکب ہے۔

" وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ -

(اور بخش دے اس کے یعنی (شرک) کے ماسوا جسے چاہے کا یہی مطلب ہے)

بہرحال جب شرک کی یہ نہ ٹلنے والی سزا ہے، یعنی جب خدا کے ملک اور حکومت میں اُس کے بندوں پہ کسی دوسرے کی حکومت و اطاعت و بندگی و عبادت کو جائز ٹھہرانے والوں کے باغی ہونے کی وجہ سے یہ اُن کی قدرتی سزا ہے، تو جو اپنے کو سر سے خدا کے لیے نہیں سمجھتا اس کی مرضی کی پابندی کو اپنا فرض خیال نہیں کرتا یعنی سرے سے حق تعالےٰ کو اپنا الٰہ ہی نہیں تسلیم کرتا، یا العیاذ باللہ خدا کے وجود ہی کا وہ منکر ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے سخت باغیوں کے سامنے خدا کا مجازاتی قانون جتنی بھی ہولناک اور مہیب شکلوں میں نمایاں ہو اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ نجات کی راہیں جب شرک ہی سے ہمیشہ کے لیے مسدود ہو جاتی ہیں تو بغاوت کی اُن شدید تر قسموں کی جو سزا بھی ہو کم ہے۔

مرضیٔ حق کی یافت کی قدرتی راہ

حق تعالےٰ کے مرضیات کی خالص اطاعت اور اس کی اور صرف اسی کی خالص بندگی و عبادت کو بلا شرکت غیرے، اپنے وجود کا حقیقی نصب العین ٹھہرانا، جب نجات کی یہ ایسی ناگزیر شرط ہے۔ جس میں کسی قسم کے استثنا رکی قطعاً گنجائش نہیں تو

Marfat.com

لزوماً انسان کے سامنے سب سے بڑا اہم سوال یہی آجاتا ہے کہ خدا کے مرضیات سے واقف ہونے کی صحیح راہ کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ کسی کی مرضی سے واقف ہونے کی عقلاً اور فطرتاً دو ہی طبعی راہیں ہو سکتی ہیں، یا تو جس کی مرضی ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں براہِ راست خود ہی اپنی مرضی سے مطلع کرے یا جسے اپنی مرضی سے اس نے آگاہ کیا ہو وہ ہم کو بتلائے۔

حق تعالیٰ کی مرضئ مبارک سے واقفیت کی مذہب نے بھی یہی دو راہیں بتائی ہیں یعنی پیغمبروں اور رسولوں کو تو حق تعالےٰ براہِ راست اپنے منشا اور مرضی سے آگاہ فرماتے ہیں اور دوسرے لوگ اللہ کے اُن ہی پیغمبروں کے ذریعہ سے اس علم کو پاتے ہیں۔

اب سوچنا چاہیے کہ ایسا آدمی جسے خدا سے بھی خدا کی مرضیات کا علم براہِ راست نہ ملا ہو اور نہ پیغمبروں کے عطا کیے ہوئے علوم کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کا اس نے فیصلہ کیا ہو، اصطلاحی الفاظ میں اُس کو یوں کہیے کہ پیغمبر پر بھی وہ ایمان نہ لایا ہو، یعنی مرضئ حق کی آگاہی کے ان دونوں قدرتی ذرائع سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے من مانے بافیدہ خیالات اور مغز سے اتارے ہوئے اپنے خود تراشیدہ وسوسوں کو خدا کی مرضی قرار دے کر اگر وہ اعلان کر رہا ہو کہ خدا ہی کی مرضی کی اطاعت اور اس کی عبدیت و بندگی کو اپنے وجود کا نصب العین میں کلی یقین کرتا ہوں اور اُسی کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں آسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس شخص پر صرف بغاوت ہی کی دفعہ کا جرم عائد نہیں ہوگا، یعنی بجائے مرضئ حق کے چونکہ اپنی مرضی کی پابندی کو در اصل یہ اپنا نصب العین

Marfat.com

بنائے ہوئے ہے اور اپنے ہی خود تراشیدہ من گھڑت خیالات کو چونکہ وہ خدا کی مرضی ٹھہرا رہا ہے تو علاوہ بغاوت کے خدا پہ بہتان بندی اور افترا پردازی کی بھی ناپاک جسارت وہ کر رہا ہے، اسی لیے بجائے ایک الزام کے بغاوت اور افترا دو ہولناک الزاموں کی آتشیں زنجیروں میں یہ جکڑا ہوا ہے — حتیٰ کہ اگر اس قسم کے باغیوں اور افترا پردازوں کے علم یا عمل کا کوئی حصہ اگر اتفاقاً حق تعالیٰ کی اُس مرضی کے مطابق بھی ہو جائے جس کا اظہار اپنے رسولوں اور پیغمبروں کے ذریعہ سے اُس نے فرمایا ہے لیکن چونکہ عملاً درحقیقت وہ اپنی ہی مرضی اور اپنے ہی خیالات کی پابندی کر رہا ہے اور افترا پردازی کی جسارت کے ساتھ کر رہا ہے کہ اپنی مرضی کو (العیاذ باللہ) خدا کی مرضی قرار دے رہا ہے اس لیے وہ بھی بغاوت اور افترا علی اللہ ہی کا مجرم ہے۔

اسی سلسلہ کا ایک شدید عصری مغالطہ

آخری بات اس سلسلہ میں قابل توجہ یہ بھی ہے جو بہتوں کے لیے اس زمانہ میں شدید مغالطوں کی وجہ بنی ہوئی ہے، یعنی مختلف زمانوں میں خدا کے نام سے خدا کی مرضیات کا اظہار دنیا کی مختلف قوموں میں جن بندگوں نے کیا تھا قطعی طور پہ اس حقیقت کے واشگاف ہو جانے کے بعد بھی کہ ان بندگوں کی پیش کی ہوئی چیزوں کا بہت سا حصہ ضائع بھی ہو چکا ہے اور جو باقی ہے اس میں بکثرت غیر اللہ کی خواہشوں اور رایوں کی آمیزش اس بڑے طریقہ سے ہو چکی ہے کہ حق تعالیٰ کی مرضیات کو ان اجنبی غیر خدائی مشوروں اور انسانی ملاوٹوں سے جدا کرنا آدمی کے بس سے باہر ہے۔ کھلی ہوئی ناقابل انکار اندرونی اور

Marfat.com

بیرونی شہادتوں سے اس حادثہ کے قطعی یقین کے بعد بھی مختلف موثرات وعوامل مثلاً قومی عصبیتوں اور ملی حمیتوں کے زیر اثر ان ہی چیزوں کو جو ان کی نگاہوں میں بھی خدا کی خالص مرضی کی نمائندگی سے محروم ہو چکی ہیں لیکن باوجود اس علم و یقین کے ان ہی کو خدا کی خالص مرضی قرار دیے چلا جانا اور اس پر اصرار کرنا۔ ان ہی کی پابندیوں کو خدا کی مرضی کی پابندی ٹھہرانا، باادنیٰ تامل معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ بھی افترا پردازی کی ایک خاص قسم ہونے کے ساتھ ساتھ شرک کی بھی ایک دردناک شکل ہے، دردناک اس لیے کہ اس کے شرک ہونے کا ان لوگوں کو بہ آسانی احساس بھی نہیں ہو سکتا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ دراصل ان تمام صورتوں میں آدمی خود اپنے نفس ہی کی خواہشوں کی اطاعت کرتا ہے اور اسی کی اطاعت کو وہ اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر زندگی گزارتا رہتا ہے مگر صرف عنوان اور لفظ کی حد تک وہ خدا کی مرضی کی پابندی کا غلط نام لیتا ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر توحید کے مطالبہ کی تکمیل ناممکن ہے۔

خصوصاً جن گزشتہ دینی پیشواؤں کو خدا کا سچا نمائندہ جن کمالات وصفات اور جن اسباب و حالات کی بنا پر قوموں نے مانا تھا اور آج تک مان رہی ہیں بجنسہٖ اُن ہی معیاری کمالات وصفات اور ان ہی اسباب و حالات کے ساتھ، بلکہ ان سے بھی زیادہ وثوق آفریں اطمینان بخش خصوصیات سے آراستہ ہو کر خدا کی نمائندگی اور نبوت کا آخری پیغام لے کر تاریخ کے روشن دنوں میں دنیا کے

Marfat.com

ایسے مرکزی مقام سے جو پیغمبر اُٹھایا گیا جس کی آواز ایک نسبت کے ساتھ مشرق و مغرب دونوں کو متاثر کر سکتی تھی اور اس نے متاثر کر دیا جو خدا کی طرف سے اس دعوے کو لے کر آیا کہ سارے جہان کے باشندوں کو ہر قسم کی آمیزشوں سے صاف و پاک کر کے خدا کی خالص حقیقی مرضی سے وہ مطلع کرے گا اور اطلاع دینے کی جتنی ممکنہ صورتیں تھیں ان سب سے کام لے کر اس نے مطلع کیا پھر جس راہ سے بھی کسی صادق کی صداقت جانچی جا سکتی ہے ہر راہ سے جانچنے اور تجربہ کرنے کا اس نے موقع دیا اور وہی جانچا اور پرکھا ہوا تجربہ تواتر کی قطعی شکلوں میں آج ساری دنیا کے سامنے جگمگا رہا ہے زمین کے کرہ پر جس کا جہاں بھی جی چاہے اُسے دیکھ سکتا ہے ڈھونڈے تو پا سکتا ہے اور اپنی اصلی حالت میں پا سکتا ہے۔

لیکن ان ہی دلی اغراض، نجس اور گندی جاہلانہ حمیتوں، قومی عصبیتوں کے ہاتھوں جو لوگ اپنی رائے اپنی خواہش کے پھندوں میں اُلجھ کر اسے دیکھنا نہیں چاہتے یا دیکھنے کے باوجود قصداً ماننے سے گریز کر رہے ہیں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کی خالص مرضی ایسی بیّن کھلی ہوئی راہ یعنی رسول مبینؐ کے ذریعہ سے ظاہر ہو چکی ہے اور جس کا جی چاہے بہ آسانی اُسے پا سکتا ہے مگر یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اب بھی جو خدا کی اس حقیقی خالص مرضی کے پانے اور اُس سے اپنے اغلاط کی تصحیح سے جھجک رہے ہیں بلکہ ان میں اکثر بر سر بغاوت ہیں تو کیا ان باغیوں کے اُس انجام میں کوئی شک کر سکتا ہے جو ہر اُس شخص کا انجام ہو سکتا ہے جو اللہ ہی کو الٰہ بنا کر جینے اور مرنے کو اپنی پیدائش کی حقیقی غایت اور اپنے وجود کا نصب العین نہیں سمجھتا۔

Marfat.com

خدا کی مطلوبہ توحید کا مطلب

یاد رکھنا چاہیے کہ "اللہ ہی کو اپنا الٰہ بنانا" یعنی اس کی مرضیات کی اطاعت اور اس کی عبدیت و بندگی کو اپنے وجود کا نصب العین قرار دینا جیسا کہ عرض کیا گیا کہ قدرتاً اس پر موقوف ہے کہ صحیح راہ سے واقعی خدا کی مرضی کا صحیح علم حاصل کیا جائے، ورنہ صرف زبان سے اس کا اقرار کہ "میں اللہ ہی کو الٰہ مانتا ہوں" یہ فقط زبان کا ایک لفظی اور ہوائی اقرار ہے اجسے عقلاً واقعہ سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آخر جو خدا کی مرضی ہی سے واقف نہیں ہے وہ خدا کی مرضیات کی اطاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین کیسے بنا سکتا ہے؟

اور لطف تو یہ ہے کہ لوگوں نے صرف زبان کے اس اقرار ہی کو نہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بات کہ جو خدا کو ایک سمجھتا ہے اس کے موحد ہونے کا فیصلہ کیے بیٹھے ہیں، اگر یہ کوئی لغوی اصطلاح ہے تو اس سے مجھے بحث نہیں لیکن حق تعالیٰ نے اپنے بندوں سے جس توحید کا مطالبہ فرمایا ہے اور انسانی وجود کی آفرینش کی جسے غایت قرار دیا ہے کیا وہ صرف یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے کیسی عجیب بات ہے، اس لحاظ سے یعنی وجوداً اور شخصیتہً ایک ہونے میں خدا کی کیا خصوصیت ہے؟ اس اعتبار سے تو ہر انفرادی شخصیت خواہ آدمی ہو یا درخت ہو، کوئی ہو، ایک ہی ہے، کیا ہم یا آپ، زید، یا عمر دو دو ہوتے ہیں؟ اور اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ عالم کے پیدا کرنے والے اور اس کے نظم کو ترتیب کے ساتھ قائم رکھنے والے کو ایک مانا جاتا ہے اور یہی بات خدا کی مطلوبہ توحید ٹھہرائی جاتی ہے۔ تو پھر قرآن کی ان آیتوں کا کیا مطلب ہے جن میں بار بار

Marfat.com

مسلسل مختلف طریقوں سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس توحید کے ماننے والے بکثرت ان لوگوں میں بھی پائے جاتے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو بھی اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہیں یعنی مشرک ہیں اور اُن کی یہ توحید شرک اور شرک کے خمیازوں سے نجات دینے کے لیے ناکافی ہے سچ تو یہ ہے کہ بجز چند استثنائی شکلوں کے توحید کے اس قسم کے اقرار سے شاید ہی کسی آدمی کا سینہ خالی ہوگا تحقیق نے تو ثابت کیا ہے کہ وہ یہ ان جزیروں کے لبش مینوں (جنگلی اور صحرائی آدمیوں) میں بھی یہ عقیدہ پایا جاتا ہے۔

پس اصل واقعہ وہی ہے جس کا میں ذکر کرتا چلا آرہا ہوں کہ اپنے بندوں سے جس توحید کا مطالبہ حق تعالےٰ نے فرمایا ہے اور اس کی تسلیم و عدم تسلیم پر انسانیت کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہے وہ وہی بات ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا الٰہ نہ بنایا جائے یعنی از آدم تا خاتم (صلے اللہ علیہ وسلم) سارے جہان کے پیغمبروں کا جو سب سے پہلا مطالبہ ہے اس مطالبہ کی تعمیل کی جائے اور کہہ چکا ہوں کہ اللہ کو الٰہ بنانے کا مطلب یہی ہے کہ حق تعالےٰ ہی کی مرضی کی اطاعت اور اسی کی بندگی و عبادت کو اپنے وجود کا آخری مطلب اور اپنی پیدائش کا حقیقی مقصد یقین کیا جائے؛

اب ظاہر ہے کہ مطلوبہ توحید جس پر نسل انسانی کی نجات اور آخری کامیابی مبنی ہے، جب اس کا یہی مطلب ہے اور قطعًا یہی ہے، تو پھر وہی بات ہوئی کہ جب تک خدا کی مرضی کا صحیح علم کمال وثوق اور کسی قطعی غیر مشکوک ذریعہ سے حاصل نہ ہو آدمی خدا کی مطلوبہ توحید کی تعمیل سے یعنی اُس کو حقیقی معنوں میں الٰہ بنانے سے قطعًا قاصر رہے گا، اس کا لا الٰہ الا اللہ صرف زبانی چند ہوائی ارتعاشات کا ایک ایسا مجموعہ ہوگا۔ جو اپنے معنے سے قطعًا بے تعلق ہے، درحقیقت بجائے اللہ کو الٰہ

Marfat.com

بنانے کے ایسا آدمی خود اپنے آپ کو یا اپنے ہی جیسے کسی انسان کو جسے خدا نے اپنی مرضی پر مطلع نہیں کیا ہے۔ الٰہ بنائے بیٹھا رہے گا، اور ظاہر ہے کہ ایسا آدمی موحد نہیں مشرک ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا بعض صورتوں میں معاذ اللہ وہ خدا پہ جھوٹ باندھنے والا اور افترا کرنے والا بھی ہے۔ اور اسی لیے اب یہ ایک واضح، ناقابلِ انکار، نہ صرف دینی و اعتقادی بلکہ ایک قدرتی اور عقلی حقیقت بھی ہے کہ

لا الٰہ الا اللہ کے کلمہ میں جس توحید کا واقعی مطالبہ کیا گیا ہے اس کی تعمیل اس دور میں محمد رسول اللہ پہ ایمان لائے بغیر ناممکن ہے۔ اللہ کا رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہ مان کر جو لا الٰہ الا اللہ کی توحید کا آج مدعی ہے وہ مشرک ہے مفتری علی اللہ ہے اپنے دماغی وسوسوں یا ایسی چیزوں کو جن میں قطعًا خدا کی مرضی انسانی خواہشات کے ساتھ خلط ملط ہو چکی ہے وہ اُن ہی کو خدا کی مرضی قرار دے رہا ہے اور محض اپنی ذاتی خواہشوں کی بنا پہ بجائے خدا کے ان ہی کی پیروی کر رہا ہے۔ میں نے اسی لیے کہا کہ وہ خدا کی مرضی نہیں بلکہ اپنی مرضی اپنی خواہش اپنے ذاتی فیصلوں کی اطاعت و پیروی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے ہوئے ہے اس کا جینا بھی خود اپنے لیے ہے اور مرنا بھی اپنے ہی لیے ہے۔ پھر جو خدا کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے لیے جیتا رہا اسے بجائے خدا کے خود اپنی ذات سے اجر کا اُمیدوار رہنا چاہیے لیکن اس کی باغیانہ زندگی جو مسلسل حق اور حق کے مرضیات کے ساتھ جنگ اور تصادم میں گزری ہے تو اگر بروز مجازات (قیامت کے دن) حق کے ارادوں کو بھی اپنے مسلسل اور دوامی تصادم کی شکل میں پائے اور تصادم کا ظہور اس روز "عذاب الیم" کے قالب میں ہو تو بتایا جائے کہ قدرتًا اس کے سوا اور کس نتیجہ کی توقع ہو سکتی ہے اور یہی مطلب ہے

Marfat.com

قرآن کی اس آیت کا

ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ و یریدون ان یفرقوا بین اللہ و رسلہ و یقولون نؤمن ببعض و نکفر ببعض و یریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلاً اولٰئک ھم الکافرون حقًّا و اعتدنا للکافرین عذابًا الیمًا ۝	جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور رسولوں میں جُدائی پیدا کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے اور چاہتے ہیں کہ درمیان میں ایک راہ نکالیں یہ لوگ پکے واقعی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے دُکھ بھرا عذاب تیار کر

رکھا ہے۔ (النساء پارہ (۶) رکوع ۱)

پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ انتخابی تصرفات کا اپنے آپ کو حق دار سمجھتے ہوئے جو رسول کے پیش کردہ پیغام کی جس چیز اور جس دفعہ کو چاہتا ہے رَد کرتا ہے اور اپنی خواہش کے مطابق جن باتوں کو پاتا ہے اُنھیں باقی رکھتا ہے تو وہ قبول کے اس صریح باغیانہ طرزِ عمل کے ساتھ کہ خدا نے جس راہ پہ چلنے کا اپنے رسول کے ذریعہ سے بندوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے خدا کی عائد کردہ اس ذمّہ داری سے من مانے طور پر اپنے کو مستثنیٰ کر کے اپنے لیے اور اپنے ماننے والوں کے لیے اپنی تجویز اپنے منشاء اپنے رجحانات کے مطابق جو نئی راہ بنا رہا ہے یعنی قرآنی الفاظ میں :-

"یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا"

Marfat.com

جس کی زندگی کا کھلا ہوا خود اعترافی دستور ہے اُس پہ
اُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ حَقًّا وہی لوگ پکے اور قطعی کافر ہیں۔
کسی تنگ خیال، تنگ دل، سبک مغز، کافر گر ملّا کی طرف سے کفر کا فتویٰ نہیں ہے بلکہ قرآن یہ اپنا ناطق فیصلہ صادر کر رہا ہے، تو قرآن کے اس ناطق اور قطعی فیصلہ کے باوجود محض اس لیے کہ قرآنی نیکیوں اور دینی سعادتوں کے بعض صالح عناصر کا اس کی سیرت سے چونکہ مظاہرہ ہو رہا ہے، مجھے اوروں سے بحث نہیں بلکہ ان سے پوچھنا ہے جو قرآنی فیصلے کو خدائی فیصلہ یقین کرتے ہیں اُن ہی سے سوال ہے کہ صرف اس مظاہر سے متاثر ہو کر اس کے کفر میں تذبذب کے اظہار سے بھی آگے بڑھ کر جو لوگ ایسوں کو ایمان و نجات کی سند دینے کے لیے بے چین نظر آرہے ہیں اور اُن کے قدموں پر جنت کی کنجیاں نثار کرنے کے لیے مضطر ہیں، ضمیر کے ٹوک کو قرآنی آیات کی غلط تاویلوں[1] سے روکنا چاہتے ہیں تو ان سے پوچھنا ہے کہ غلط رواداری کے ان بیماروں نے کبھی اس پہ بھی غور کیا ہے کہ کفر کی یہ تقدیس کہیں قرآن کی صریح نصوص

---

[1] میرا اشارہ ان آیتوں کی طرف ہے جن میں سب سے زیادہ شہرت اس زمانہ میں سورۂ بقرہ کی آیت کو حاصل ہوئی ہے۔ ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصارٰی والصابئین من اٰمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحًا فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ - کا حاصل یہ ہے کہ ایمان والے لوگ اور یہود و نصاریٰ و صابئین ہیں جو اللہ اور یوم آخر (قیامت) پہ ایمان لائیں۔ اور عمل صالح کریں گے، تو ان کی مزدوری، ان کے مالک کے پاس ہے اور ایسوں کے لیے

(باقی ص ۱۸۶ پہ)

Marfat.com

کی تکذیب تو نہیں بن رہی ہے ؟ بہر حال میرا خطاب اس خاص مسئلہ میں اس وقت اُن ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۵) نہ اندیشہ ہے۔ نہ یہ لوگ آئندہ غمگین ہوں گے یعنی وہ نجات یاب ہوں گے۔

بعض ذمہ دار اہل قلم نے اس آیت کو پیش کر کے دعویٰ کیا ہے کہ نجات کے لیے قرآن نے اپنی اس آیت میں صرف تین باتوں یعنی اللہ پہ، یوم آخر پہ ایمان اور عمل صالح کو ضروری قرار دیا ہے چونکہ رسول پہ ایمان لانے کا اس میں ذکر نہیں ہے اس لیے معلوم ہوا کہ ایمان بہ رسالت کی نجات کے لیے ضرورت نہیں ہے، اپنے اس اجتہاد کی بنیاد پہ ان حضرات نے بعض ایسے لوگوں کو جو علانیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ نبوت کی تکذیب کرتے ہیں یعنی آپ کو سارے جہاں کا پیغمبر نہیں مانتے یا پیغمبر ہی نہیں مانتے ان کو نجات کی سند عطا فرمائی ہے ظاہر ہے کہ جنت ہو یا دوزخ اس پہ نہ ہمارا اختیار ہے نہ ان حضرات کا، لیکن میں تو صرف واقعہ کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں یعنی واقعہ میں قرآن کا کیا فی الحقیقت یہی دعویٰ ہے؟ — کیسی عجیب بات ہے اسی سورہ بقرہ میں مذکورہ بالا آیت کے بعد جو یہ الفاظ ہیں لا خَوْفٌ علیھم وَلَا ھُمْ یحزنون۔" جس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ یہ لوگ نجات یافتہ ہوں گے ان ہی الفاظ کا ذکر مختلف آیتوں میں کیا گیا ہے جن میں ایک آیت ہے" بلیٰ من اَسْلَمَ وجھہ للہ وھو محسن فَلَہٗ اجرہ عند ربھم وَلَا خَوْفٌ علیھم ولا ھم یحزنون۔" یعنی اللہ کے سامنے گردن جھکانے اور محسن ہونے کا نتیجہ

(باقی ص ۱۸۷ پہ)

Marfat.com

لوگوں کی طرف ہے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو واقعی خدا کا رسول اور قرآن کو واقعی خدا کا کلام یقین کرتے ہیں، ورنہ اپنے خود تراشیدہ خیالات کو

(حاشیہ لبسلسلہ صفحہ گزشتہ) وہی "لا خوفٌ علیہم ولا ھم یحزنون" قرار دیا گیا ہے تو کیا نجات کے لیے صرف اللہ کا مان لینا کافی ہے، اس سے بھی آگے چل کر اس سورہ میں الذین ینفقون موالھم باللیل والنھار سرًّا وعلانیۃً وَلَا خَوفٌ عَلَیہِم وَلَا ھُم یَحزَنُونَ۔" کی آیت ہے جس میں اسی عدم خوف و عدم حزن کو محض اس انفاق و خیر و خیرات کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے جو رات اور دن میں کوئی کرے پھر کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا کا، قیامت کا، عمل صالح سب کا انکار کر کے جو جیب دٹی اور خیر و خیرات کے ابواب میں حصّہ لیتا رہے گا، یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کی اس آیت میں خدا، قیامت اور عمل صالح کے اس منکر کی نجات کی بشارت سُنائی گئی ہے؟

اگر ایسا نہیں ہے تو پھر پہلی آیت کے ظاہر مفہوم پر کیوں اصرار کیا جا رہا ہے اگر ان پچھلی آیتوں کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے اور بلاشبہ واقعہ بھی یہی ہے کہ واقعی نجات جن امور پر موقوف ہے، اُن آیتوں میں سب کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اُن کے مختلف عناصر اور اجزا کا ذکر اپنے اپنے مقام پر کیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ نجات کے لیے ان امور کی ضرورت ہے، یہ مقصد نہیں ہے کہ صرف ان ہی کی ضرورت ہے مثلاً انفاق اور خیر و خیرات یہ بھی منجملہ اسباب نجات کے ایک سبب ہے لیکن یہی انفاق

(بقیہ صفحہ ۱۸۸ پر)

Marfat.com

خدا کی مرضی قرار دینے کی جن میں جرأت ہے جو اپنے دماغ ہی کو خدا کے رسول کا قائم مقام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۷) جب خدا کے انکار، قیامت کے انکار یا شرک وغیرہ کے ساتھ جمع ہو جائے تو اس وقت بھی اس میں یہ خاصیت باقی رہتی ہے یا نہیں؟ اس آیت میں اس کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ہمیں اسلام کے کلی اصول کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ پس جو حال ان پچھلی آیتوں کے " لا خوفٌ علیہم و لا ھم یحزنون " کا ہے یہی حال اس کا بھی ہے جس سے یہ غلط نتیجہ نکالا جا رہا ہے کہ نجات کے لیے رسول پر یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی حاجت نہیں۔

حالانکہ جس موقعہ پہ یہ آیت قرآن میں پائی جاتی ہے اگر اس کے ماسبق کا بغور مطالعہ کیا جائے تو خود بخود مطلب کھل جاتا ہے واقعہ یوں ہے کہ بنی اسرائیل کے قصص کا ذکر ہوتا چلا آ رہا تھا جن میں اس واقعہ کا تذکرہ آیا کہ بنی اسرائیل کو مصر (شہر میں اُترنے کا حکم دیا گیا جو خود ان کی خواہش کا نتیجہ تھا، شاید اس لیے اس کی تعبیر اھبطو (اُتر جاؤ) سے کی گئی ہے، گویا ایک ہبوط اور تنزل تو انسانیت کا وہ تھا کہ آدم اور حوا جنت سے اسی اھبطوا کے حکم سے نکلے اور دوسرا تنزل انسانیت کا اس کے بعد یہ ہوا کہ میدانوں کی صاف ستھری زندگی کو چھوڑ کر وہ شہر کی گنجان غلیظ کثیف ردی آب و ہوا والی زندگی میں گرفتار ہوئی، قرآن میں ہے کہ شہر میں اُترنے کا تو اُن کو حکم دے دیا گیا ہے، اور یہ بھی کہہ دیا گیا کہ وہاں تمہاری ان خواہشوں کی تکمیل ہوگی جو تم چاہتے ہو یعنی طرح طرح کے کھانے، اب بھی شہر ہی میں چائے و قہوہ اور مشروبات و ماکولات کے ہوٹل وغیرہ مل سکتے ہیں ورنہ

Marfat.com

بنا کر اس کی سوچی ہوئی باتوں کو اپنے لیے خدا کا پیغام سمجھے ہوئے ہیں ظاہر ہے کہ ان کے تصورات و مفروضات کا میدان بہت وسیع ہے جس کے متعلق چاہیں جنتی ہونے کا فتویٰ صادر کر دیں اور جسے چاہیں ابد کے لیے جہنم کا کندہ بنا دیں۔

(حاشیہ بسلسلہ صے ۱۸۸) دیہاتی ان لذتوں سے اب بھی محروم ہیں) مگر ان سطحی و قستی لذتوں کے ساتھ قرآن میں اس پہ بھی متنبہ کر دیا گیا کہ شہری زندگی میں تم پہ ذلت اور مسکنت کی مار پڑے گی، کیونکہ شہری زندگی ہی میں مال و جاہ و ثروت و دولت کے اعتبار سے افراد انسانی میں اتنا تفاوت پیدا ہو جاتا ہے کہ اکثریت کو اپنی دولت مسکنت اور اپنی ہر عزت ذلت محسوس ہوتی ہے اس کے سوا یہ بھی کہا گیا کہ شہری زندگی انسان کو اپنے حدود دیہ قائم نہیں رہنے دیتی جس کا لازمی نتیجہ عصیان ہے اور عصیان خدا کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ عموماً ہر تمدن کا آخری خاتمہ شہری آبادیوں کی سرکشیوں پہ ہوا۔

مگر بہرحال آدمی جنت سے اتر کر زمین پہ آیا اور زمین کے میدانوں سے اتر کر وہ شہری زندگی کا شکار ہو ہی گیا، اس کے بعد یہ زیر بحث آیت ہے یعنی ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا الاٰیۃ جس سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اب تو آدمی جس حال میں بھی ہے رہے گا چاہیے کہ اسی زندگی میں اپنے کو درست کرے درستی کے چند اہم عناصر ایمان باللہ ایمان بالآخرۃ اور عمل صالح کا ذکر کر دیا گیا، باقی شہری زندگی کی کش مکش میں عموماً جماعت بندی کا جو عارضہ پھیل جاتا ہے اپنے

(بقیہ صے ۱۹۰ پر)

Marfat.com

نبوت محمدیہ کے ساتھ نجات کی وابستگی کی جو وجہ اب تک بیان کی گئی وہ تو صرف ایک

(حاشیہ بسلسلہ ص۱۸۹) گندے دنیٰ اغراض میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے چالاک افراد غریب عوام کے سامنے کوئی ایسا نقطۂ اجتماع پیش کرتے ہیں جس کے مغالطہ میں مبتلا ہوکر عوام ان لوگوں پہ جمع ہو جاتے ہیں، کام ان چند چالاک نفوس کا نکلتا ہے اور قربانی عوام کی ہوتی ہے، زبان، نسل، وطن یہ سارے اشتراکی نقاط اسی پارٹی بندی کے ہتھکنڈے ہیں، انتہا یہ ہے کہ مذہب اور دین جو صرف طہارت و اخلاص، صداقت اور راست بازی کے حصول کا واحد ذریعہ ہے، لبا اوقات اس کا استعمال بھی اس پارٹی بندی اور جماعتی جذبات کے اُبھارنے کے لیے کیا جاتا ہے اس موقعہ پہ قرآن کو اسی پہ تنبیہ کرنی ہے کہ شہری زندگی میں مبتلا ہو جانے کے بعد بھی اگر آدمی چاہے تو مذہب کے صحیح استعمال سے نجات حاصل کر سکتا ہے لیکن اگر مذہب سے بھی وہی کام لیا جائے جو وطنیت اور نسلیت وغیرہ سے لیا جاتا ہے یعنی انسانوں کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹ کر اُن کے کسی ٹکڑے کی اجتماعی قوت سے ارباب اغراض نفع اُٹھائیں، تو پھر ایسا نام نہاد مذہب باعث نجات نہیں ہوسکتا، خلاصہ یہ ہے کہ نجات جن اُمور پہ موقوف ہے اُن کا استیعاب اس آیت میں نہیں کیا گیا ہے بلکہ اُس کے بعض مؤثر عناصر جن پہ اعتماد کرنے کے بعد انسانیت مذہب کے صحیح استعمال پہ قادر ہوسکتی ہے صرف اُن کا ذکر کیا گیا ہے، یا یوں کہیے کہ نجات جن اُمور پہ موقوف ہے اُن کے بعض ایجابی اجزا کا یہاں ذکر ہے لیکن اُس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اُن کے سوا نجات کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہاتی ص۱۹۱ پہ

Marfat.com

تاریخی واقعہ اور نفس الامری حقیقت کا نتیجہ ہے یعنی اللہ ہی کو الٰہ بنانے کے اللہ کی صحیح وخالص مرضی کی یافت نبوت محمدیہ کے سوا اب کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں، اس لیے نجات کی طلب اور انسانیت کی ارتقائی یافت کے حصول کی واقع کے

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۱۹۰) یہ قرآن میں اپنی طرف سے اضافہ ہے۔ جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے اُن کی نجات ہوگی اس آیت سے بس اسی قدر معلوم ہوتا ہے، مگر رسول کی تکذیب بھی اسی کے ساتھ اگر کریں گے اُن کے انجام سے یہ آیت ساکت ہے اور اس کا پتہ قرآن کی دوسری آیتوں سے چلتا ہے، جن میں صاف بتایا گیا ہے کہ اللہ اور اُس کے رسولوں میں تفریق کرنے والے " الکافرون حقا " ہیں بلکہ اسی سورہ بقر میں " لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون " کے الفاظ کا ذکر پہلی دفعہ جہاں ہوا ہے، وہاں فرمایا گیا ہے کہ فمن تبع ھدای فلا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون " جس کا حاصل یہی ہے کہ اس ہبوطی زندگی میں نسل انسانی کی نجات کی صرف ایک ہی راہ رہ گئی ہے، یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے ہداۃ اور رسل جو آتے رہیں گے اُن کی پیروی کی جائے۔ کہ اُن ہی کے ذریعہ سے حق تعالیٰ اپنی مرضیات کو بندوں پہ ظاہر فرمائیں گے پس نجات کی پہلی شرط تو اس آیت کی رو سے ایمان بالرسالت ہی ہے۔ آگے جن جن آیتوں میں " لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون " کا اس سورہ میں ذکر ہے ان پیغمبروں کی لائی ہوئی تعلیم کے مختلف اجزا ہیں۔ ۱۲

Marfat.com

لحاظ سے اب صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔

اس کے سوا یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ جن خصوصیات ، شکل و صورت اندرونی و بیرونی صفات و حالات کی بنا پہ مثلاً ہم اپنے کو یا اپنے ملنے والوں کو آدمی سمجھتے ہیں ، پھر ان ہی خصوصیات کے ساتھ جب کوئی اجنبی آدمی ہمارے سامنے آئے تو کیا صرف اس لیے کہ اب تک ہم نے اس کو نہیں دیکھا تھا یا ہم نے ہمارے باپ داداؤں نے اس اجنبی کو چونکہ آدمی نہیں مانا تھا اس لیے اس کے آدمی ہونے میں شک کر سکتے ہیں ؟ جو اس میں بھی شک اندازی کرے گا ظاہر ہے کہ قصداً شرارت یا کسی اور غرض سے ایسا کر سکتا ہے یعنی آدمی یقین کرتے ہوئے محض کسی وقتی مصلحت یا طبعی شرارت کی وجہ سے زبان سے اس کے آدمی ہونے کا انکار کرے گا۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا ۔"	انھوں نے اس کا انکار کیا حالانکہ اُن کا جی مان چکا تھا ، انکار صرف ظلم اور سرکشی کی وجہ سے کر رہے ہیں۔

کی کریمۂ قرآنیہ میں انسانی نفس کی اسی باغیانہ کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پھر جیساکہ میں نے عرض کیا تھا کہ قوموں نے جن خصوصیات و علامات کی بناء پر اپنے جن پیشواؤں کو خدا کی مرضی کا نمائندہ مان رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اُن ہی بلکہ اُن سے بہتر کمالات و خصوصیات کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو خدا کی مرضی کے اُن ہی نمائندوں میں سے ایک نمائندہ اور ان ہی رسولوں میں سے ایک رسول قرار دیا ، تو جنہیں آپ کی رسالت میں اب تک شک ہے کیا اُن کا حال اُس شخص کا سا نہیں ہے جو ایک شخص میں تمام انسانی خصوصیات

Marfat.com

کو دیکھ رہا ہے لیکن باوجود اس کے اُس کے آدمی ہونے میں شک کر رہا ہے، صرف اسی لیے شک کر رہا ہے کہ شک ہی کا قطعی ارادہ پہلے سے وہ طے کیے ہوئے ہے۔

اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر دنیا کے تمام مذہبی، اور دینی وثیقوں پہ وہ حادثہ بھی پیش آتا جس کی وجہ سے کسی پیغمبر کا پیغام یا کسی قوم کا آسمانی دستور اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہا ہے جس کا دوسروں ہی کو نہیں خود ان پیغمبروں کے ماننے والوں اور اُن مذاہب کی پیروی کرنے والوں کو بھی اعتراف ہے، بہر حال اگر یہ صورت نہ بھی پیش آتی جب بھی قوموں نے جن بنیادوں پہ اپنے رسولوں اور پیغمبروں کو خدا کا نمائندہ اور خدا کی مرضی کا ظاہر کرنے والا مانا ہے، جب وہ ساری باتیں بالوجہ الاتم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات میں پائی جا رہی ہیں تو پھر آپ کی اور آپ کے دعوے کی تکذیب کی عقلاً و فطرتاً کسی کے پاس کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟ قرآن میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیلوں میں اس دلیل کا ذکر بھی

ما کنت بدعًا من الرسل (نہیں ہوں میں رسولوں میں کوئی انوکھا)

وغیرہ جیسی آیتوں میں کیا گیا ہے۔

کچھ نہیں تو کم از کم آج مسلمانوں کو جو یہ مجبوری پیش آ رہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد کسی قسم کی نبوت کے کسی دعویٰ کو تسلیم کرنے میں علاوہ اس واقعی وجہ کے کیوں ایک غلط فہمی کی، بغیر کسی ضرورت کے خواہ مخواہ ضرورت محسوس کی جائے، بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس نبوت کی تصدیق ایک

Marfat.com

دوسری نبوتِ صادقہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تکذیب بن جاتی ہے میرا مطلب یہ ہے کہ منجملہ اور خصوصیتوں کے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کی ایک بڑی خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ آخری نبوت ہے اور آپ کے بعد پھر کوئی نبی نہیں آئے گا، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ آپ کے بعد نبوت کا جو دعوے بھی کیا جائے گا، اس کی تصدیق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دعویٔ ختم نبوت کی تکذیب ہوگی۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ماننے میں دنیا کی قوموں کے لیے اس قسم کی بھی تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اس لیے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا اُن تمام ادیان و مذاہب کے پیش آنے والوں نے جن کی طرف آج دنیا کے مذاہب منسوب ہیں، ان میں سے کسی نے بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ میری نبوت آخری نبوت ہے، بلکہ اس باب میں تو معاملہ بالعکس ہے، یعنی جن بچی کھچی صورتوں میں آج دُنیا کی مذہبی یادداشتیں پائی جاتی ہیں تقریبًا سب ہی میں کسی نہ کسی طرح اس کا سراغ ملتا ہے کہ "آنے والے نبی" کی اپنی اپنی اُمتوں کو اُنھوں نے بشارت سُنائی تھی اور خود قرآن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف توراۃ وانجیل والے بلکہ ان کے سوا بھی خدا نے اپنے تمام پیغمبروں سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق میثاق اور معاہدہ لیا ہے، بائبل کے بعض نبیوں نے اسی لیے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا نام ہی "میثاق کا نبی" بنایا ہے اخیر یہ ایک مستقل جداگانہ بحث ہے جس کے لیے مستقل کتابوں کا مطالعہ مفید ہوگا۔ یہاں تو صرف ضمنًا ذکر آگیا مجھے تو یہاں کہنا یہ تھا کہ مذہب

Marfat.com

کے اس حادثہ کی وجہ سے کہ ان کے اساسی وثائق کے مشتبہ اور مشکوک ہونے کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان جہاں دنیا کی موجودہ نسلوں کے لیے ایک واقعاتی ناگزیر ضرورت ہوگئی ہے کہ پیغام محمدی کے سوا قطعی اور یقینی شکل میں مرضی حق کی یافت کی کوئی شکل کسی کے پاس اب باقی نہیں رہی ہے! یوں بھی آنحضرت کی نبوت کا دعویٰ بجائے خود ایک واقعہ ہے جو اپنا ثبوت خود اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، اس خاص پہلو کی ایک حد تک تشریح میں نے اپنے مختصر رسالہ "النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم" میں کی ہے۔

مسئلہ تبلیغ و مواخذہ کی ایک دشواری اور اس کا حل

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جسے چاہیے تو یہی تھا کہ جس طرح اب تک اس سے چشم پوشی برتی جارہی ہے نہ برتی جاتی، میرا مطلب یہ ہے کہ نبوت محمدیہ کے لحاظ سے ایک گروہ تو ان کا ہے جنہوں نے اس کو تسلیم کر کے حق تعالیٰ سے اپنا غیر مشکوک ربط قائم کر لیا ہے جنہیں ہم مسلمان کہتے ہیں، اُن کے بالمقابل دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو ارادۃً و قصداً خود اپنے سامنے اور اپنے ماننے والوں کے سامنے تنکو[1] کو شہتیر بنا کر اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مثلاً یورپ میں ایک مدت تک پادریوں نے خود تراشیدہ افسانوں میں پناہ ڈھونڈھی مشہور ہے کہ گریگوری پادری نے قصہ تراشا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کبوتر پال لیا تھا جسے آپ کان میں دانہ رکھ کر کھلایا کرتے تھے (باقی ص ۱۹۶ پر)

Marfat.com

کے دعویٰ کی تسلیم سے گریز نہ کیا جائے جیسا کہ منکرین اسلام کا عام حال ہے، لیکن سوال

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۱۹۵) اور عوام کو باور کرایا جاتا تھا کہ یہی جبریل ہیں جو کان میں چونچ ڈال کر خدا کی باتیں آپ کو سناتے ہیں، اسی قسم کے بیسیوں قصے عیسائیوں میں ان پادریوں نے مشہور کر دیے تھے لیکن جب پوپیت اور پادریت کے نظام پر مذہبی طبقہ یورپ میں تمام طبقوں کے مقابلہ میں ذلیل ٹھرایا گیا جس کا تھوڑا بہت اثر مشرق میں بھی پہنچا ہے، یورپ ہی کی تقلید میں عموماً مشرقی کے مغربیت زدہ نفوس بھی مذہبی لوگوں کی توہین کو اپنا پیشہ بنائے ہوئے ہیں میرا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا پردازیوں ہی کا خمیازہ ہے جو عیسائی مذہب کے پیشوا بھگت رہے ہیں۔ بہرحال جب مذہب اور مذہبی گروہ کی ہوا یورپ میں اکھڑی اور تعلیم یافتہ طبقہ نے علم و تحقیق کی باگ اپنے ہاتھ میں لی تو صریح غلط بیانی اور افترا پردازی کی جرأت تو نہ کر سکے، لیکن رائی کو پربت بنا کر اپنی اور اپنے ملک کے باشندوں کی بصیرت کے سامنے کھڑا کرنے میں انھوں نے بھی کوئی کمی نہیں کی، بحیرہ راہب یا اس قسم کے چند خواندہ و نویسندہ عیسائیوں کی سرسری ملاقات کو فلسفہ بنایا گیا اور "محمدی پیغام" کے سارے چشمے ان کو ان ملاقاتوں میں نظر آ گئے۔ گویا دعوے کیا گیا کہ محمد صلعم اللہ کے رسول نہ تھے۔ اس لیے کہ نو سال کی عمر میں ثابت ہے کہ چند لمحات کے لیے آپ کی ملاقات بحیرا راہب سے ہوئی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام جن کی تعلیم و تربیت مصر کے شاہی خانوادے میں ہوئی مسیح علیہ السلام جو یہودی فقہا و علماء ہی کے حلقہ میں پیدا ہوئے، ان ہی میں پلے بڑھے جوان ہوئے، لیکن باوجود اس کے ان ہی تعلیم یافتہ اسکالر عیسائیوں کے (باقی صفحہ ۱۹۷ پر)

Marfat.com

یہ ہے کہ — آدم علیہ السلام کی ساری اولاد میں ہر ایک کی طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

(حاشیہ سلسلہ صفحہ ۱۹۶) نزدیک ان بزرگوں کی نبوت میں اس سے خلل نہیں پیدا ہوتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بحیرا یا جبر وجبیر یا ورقہ جیسے نیم خواندہ عیسائیوں کی سرسری ملاقاتیں تکذیب نبوت کے لیے کافی ہیں۔ "تم اس لیے نبی نہیں ہو، کہ تمہاری ملاقات چند پڑھے لکھے آدمیوں سے ثابت ہے۔" خیال کرنے کی بات ہے کہ اس دعویٰ اور دلیل میں کیا وہی نسبت نہیں ہے کہ کسی نے دعویٰ کیا کہ دنیا گول ہے، دلیل پوچھی گئی، تو فرمانے لگے کہ چاول چونکہ سپید ہوتا ہے اس لیے دنیا کا گول ہونا ضروری ہے، کیسی عجیب بات ہے، آج ہر ہندو شری کرشن کی سوانح عمری میں یہ پڑھتا ہے کہ انھوں نے باضابطہ شاندیپن گرو کے آشرم میں بدیا کی تحصیل کی تھی لیکن باوجود اس کے اُن کو اس کا خطرہ بھی نہیں ہوتا کہ اُن کی یہ تعلیم اس خدا کی نسبت کے منافی ہے جو ہندوؤں کے نزدیک سری کرشن کو حاصل تھی، واقعہ یہ ہے کہ بحیرا راہب وغیرہ کے واقعات اگر صحیح بھی ہوں، اگرچہ اس میں بھی بہت کچھ شک ہے، لیکن اُن کی ملاقاتوں سے یورپ کے ارباب ریسرچ وتحقیق جس نتیجہ کو پیدا کر کے اپنے اوپر اور اپنے ملک کے حامیوں پر سچائی کے ماننے کی راہیں بند کر رہے ہیں، اُس میں اور پرانے پادریوں کے خود تراشیدہ جھوٹے واقعات میں کوئی فرق نہیں ہے، سورۂ دخان میں حق تعالےٰ اُن لوگوں کا ذکر کر کے جو خداوند قدوس اور اس کی الوہیت میں شک کر رہے ہیں اور اللہ کے "رسول مبین" کے متعلق تحقیق وریسرچ کی داد دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ (باقی صفحہ ۱۹۸ پر)

Marfat.com

مبعوث ہونا جب ایک قطعی قرآنی عقیدہ ہے تو کیا اُن میں مندرجہ بالا دو طبقوں (مسلمانوں

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۱۹۷) وہ "معلم" مجنون ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:۔
قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۔ (یعنی انھوں نے اس کھلے ہوئے رسول کو کہا کہ دوسرے کا سکھایا ہوا ہے، دماغ میں اس کے فتور ہے) ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں یعنی لہیات میں ایگناسٹک (شکی اور لاادری ہونا) اور "رسول مبین" کے متعلق "معلم" "مجنون" کا اتہام لگانا، یہ دونوں خصوصیتیں آج یورپ ہی میں پائی جاتی ہیں لامحدود کتابوں کا وہ سارا ذخیرہ جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یورپ میں لکھی گئی ہیں۔ اُن کا خلاصہ صرف ان ہی دو الفاظ "معلم مجنون" میں قرآن نے نچوڑ کر رکھ دیا ہے، پھر معلمیت کے لیے بحیرا وغیرہ کے نام تلاش کیے گئے ہیں، اور مجنونیت کے لیے وحی کی خاص کیفیت کو دلیل بنایا گیا ہے، یعنی دماغی فتور کی علامت نزول وحی کی کیفیت قرار دی گئی ہے العظمت للہ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے اسی سورۃ میں ایک عجیب عذاب یعنی "دخان مبین" (کھلے ہوئے دھوئیں) کی جو دھمکی دی گئی ہے۔ اس میں عصرِ حاضر کی اُن میکانیکی جنگوں کی طرف بھی اشارہ ہو جن میں استعمال ہونے والے آلاتِ حرب میں جو چیز بطور قدر مشترک کے نظر آتی ہے وہ یہی "دخان مبین" کھلا ہوا دھواں ہے۔ آخر توپ، بندوق، بم، مشین گن جنگی بیڑے، بحری ہوں یا ہوائی، کیا اُن آتشیں آلات میں کوئی بھی ایسی چیز ہے جس کا تعلق "دخان" دھوئیں سے نہ ہو، ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ جنگِ عظیم کے بعد سے "دخان مبین" کے اسی عذاب میں مبتلا ہے، اور کون جانتا ہے کہ اس عذاب

(باقی صفحہ ۱۹۹ پر)

Marfat.com

اور مذکورہ بالا قسم کے کافروں منکروں) کے سوا کوئی اور طبقہ نسل انسانی میں نہیں پایا جاتا؟

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۱۹۸) کا جو خود اسی کے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا ہے آخری انجام کیا ہوگا؟ میں تو صرف اس کا تماشا کر رہا ہوں کہ "رسول مبین" پر جنہوں نے "معلّم مجنون" کا الزام لگایا تھا، اور سمجھتے تھے کہ اس کا بدلہ لینے والا کوئی نہیں ہے، آخر وہی انتقام لینے والا جس کے متعلق یہ شک میں تھے ان کے سامنے۔

یوم نبطش البطشۃ الکبریٰ — اُس دن ہم پکڑیں گے بڑی پکڑ ہم

انا منتقمون۔ — انتقام لینے والے ہیں۔

کی شکل میں آگیا۔ جنگ کی خبروں میں عموماً یہی پڑھا جاتا ہے کہ فضا دھوئیں سے معمور تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد "جوہری بم" بھی سامنے آگیا۔ لکھا ہے کہ جوہری بم کے گرانے کے بعد چالیس میل اس دخان (دھوئیں) کا قطر تھا جو فضا میں پھیل گیا تھا مناسب ہوگا کہ اس موقع پر سورہ دخان کے ابتدائی رکوع کا غور سے مطالعہ کیا جائے اُن پر تعجب ہے کہ جنہوں نے "دخان مبین" کے اس عذاب کو قیامت کے واقعات میں شمار کیا ہے اگرچہ اس کی تردید خود حضرت ابن مسعود صحابی سے منقول ہے نیز آگے فرعونی تمدن کی تباہی کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوا کہ اس عذاب کا تعلق بھی کچھ اس قسم کی فرعونیت سے ہے، لبعضوں نے ابن مسعود ہی کی طرف یہ روایت منسوب کی ہے کہ وہ اس سے قحط کا عذاب مراد لیتے ہیں، لیکن سنداً یہ روایت بہت کچھ قابلِ نقد و بحث ہے، علاوہ اس کے قرینہ صارفہ کے بغیر قرآنی الفاظ کے حقیقی معانی کو ترک کر کے مجازی معنی مراد لینا یوں بھی تفسیر کے کلی اصول کے خلاف ہے۔

(باقی صفحہ ۲۰۰ پر)

Marfat.com

خواہ سنداً ان حدیثوں کے متعلق کچھ بھی کہا جائے لیکن بعض روایتوں میں جو یہ ...... آیا ہے۔

اربعۃ یحجون یوم القیمۃ رجل اصم لا یسمع شیئاً ورجل احمق ورجل ھرمٌ ورجل مات بالفترۃ۔

چار آدمی قیامت کے دن اپنی معذوری کی دلیل پیش کریں گے۔ بہرا آدمی جو کچھ نہ سنتا ہو، احمق آدمی، بڈھا شیخ فانی، اور جو فترۃ (یعنی جس زمانہ میں نبوت کی تعلیم کے آثار باقی نہ رہے ہوں) میں مرے (ہم جسے درس نبوت کے ناغہ ہونے کا زمانہ کہہ سکتے ہیں)

یا قریب قریب اسی قسم کے الفاظ دوسری روایت کے جو یہ ہیں :۔

یوتی یوم القیامۃ بالممسوخ عقلاً وبالھالک بالفترۃ وبالھالک صغیراً۔

قیامت کے دن چند آدمی لائے جائیں گے یعنی وہ لوگ جن کی عقل مسخ تھی اور جو لوگ فترۃ (ناغہ ہونے) کے زمانہ میں مرے اور جو لوگ کم عمری میں مرتے۔

تیسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں :۔

یوتی یوم القیامۃ باربعۃ المولود والمعتوہ ومن مات

قیامت کے دن چار آدمی لائے جائیں گے کم عمر بچے، مخبوط العقل اور فترت کے

(حاشیہ سلسلہ صفحہ ۱۹۹) بہرحال ان آیات کی تاویل کا یہ ایک پہلو تھا جو ذہن میں آیا ہے۔ اہل علم ونظر اس پہ غور فرمالیں۔ ۱۲ منہ

Marfat.com

بالفترۃ والشیخ الھرم الفانی۔ کے زمانہ میں مرنے والے اور جو آدمی بڈھا ہو کر عقل و ہوش کھو بیٹھا ہو۔

ان حدیثوں سے اگر کچھ نہیں تو اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نسل انسانی کے بعض افراد کے متعلق (یعنی وہی جن کا ان حدیثوں میں ذکر ہے، اُن کے انجام کے متعلق) کچھ آج ہی نہیں بلکہ ابتداء اسلام ہی سے سوال اُٹھایا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ ایسے آدمی جو کسی اندرونی رکاوٹ اور موانع و عوائق کے شکار ہیں مثلاً فطرۃً اُن کی دماغی حالت اتنی پست ہے کہ جانوروں میں اور اُن کی ذہنی کیفیت میں چنداں تفاوت نہ ہو، روایت میں جنہیں معتوہ یا المسوخ عقلاً قرار دیا گیا ہے، یا دماغی حالت کے نشو و نما سے پہلے مثلاً مر گئے (روایت میں المولود سے جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے) یا بڑھاپے کی وجہ سے ہوش و حواس کھو کر لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا یعنی جاننے کے بعد پھر جاننے کی صلاحیت اُن کی مفقود ہوگئی ہو (جنہیں الشیخ الھرم الفانی کے الفاظ سے موسوم کیا گیا ہے) اور جس طرح ان اندرونی رکاوٹوں کی کیفیت ہے۔ کبھی بیرونی ماحول بعضوں کا ایسا ہوتا ہے، جیسے ان لوگوں کا حال ہے جو فترۃ کے زمانہ میں مر گئے۔ مثلاً نبوّت سے پہلے، عرب میں ایام جاہلیت کے لوگوں کا جو حال تھا جن کے متعلق قرآن میں ما انذر آباءھم (ان کے باپ دادا ڈرائے نہ گئے) کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔

تو سوال یہ ہے کہ عناد و جحود اور "ظلم و علو" کے ساتھ جو "نبوت عامہ محمدیہ" کا انکار کر کے مرتکب کفر ہو رہے ہیں، ان صریح بے ایمانوں میں اور اُن لوگوں میں مندرجہ بالا اندرونی یا بیرونی رکاوٹوں کی وجہ سے "نبوت محمدیہ" پہ ایمان لانے

Marfat.com

کی دولت سے محروم رہے ہیں کیا ان دونوں محروموں کو ایک ہی صف میں رکھنا صحیح ہوگا؟ یا مدارج کے لحاظ سے اُن میں کچھ فرق ہے؟ اور اگر کچھ فرق ہے، تو اُن کے انجام پر بھی اس فرق کا کوئی اثر مرتب ہو سکتا ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے جن روایتوں کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، اُن کی سند کا حال کچھ بھی ہو، اتنا تو اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے افراد کے متعلق سوال پہلے بھی پیدا ہوا، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ کتابوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ مختلف زمانوں میں اس سوال کو اُٹھایا گیا، اور مختلف لوگوں نے چاہا کہ اس کا جواب دیں۔

سوال میں پیچیدگی کی وجہ

حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں ایک جگہ اس سوال کو اُٹھاتے ہوئے ایک عجیب بات لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں عام خیال جو یہ پھیلا ہوا ہے کہ انسانی افراد کی دو ہی قسمیں ہیں، جنتی اور دوزخی یعنی کچھ لوگ جنت کے مستحق ہیں اور کچھ دوزخ کے، گویا جو آدمی ہے ان دو قسموں کے سوا تیسری قسم میں وہ داخل ہی نہیں ہو سکتا مگر آدمی کے سوا دوسرے جانوروں کے متعلق یہ خیال ہے کہ ایک جانور نے کسی دوسرے جانور کو بلا وجہ مثلاً اگر لات ماری ہو، یا سینگ سے مارا ہو۔ یا کچھ اسی قسم کی زیادتی اگر کی ہے تو قیامت کے دن مظلوم جانور کو ظالم سے بدلہ لینے کا موقع دیا جائے گا۔ اور اس کے بعد ظالم و مظلوم دونوں معدوم کر دیے جائیں گے۔ مجدد صاحب نے اس بارہ میں لکھا ہے کہ اشاعرہ یعنی مسلمان عموماً جس خیال کے پیرو ہیں اُن کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

Marfat.com

كما يلزم من مذهب الاشعري نعدم القول بالواسطة بين الجنة والنار۔

(انسانی افراد کی انجام کے حساب سے دو ہی قسمیں ہیں) جیسا کہ الاشعری کے مذہب کا اختصار ہے کیونکہ یہ لوگ الجنتہ اور النار کے درمیان کسی واسطہ کے قائل نہیں ہیں۔

اس عام خیال کو نقل کرتے ہوئے حضرت مجدد صرف ان ہی لوگوں کے متعلق نہیں جو بے چارے عقل و فہم سے عاری ہیں، بلکہ جو عقل و فہم والے بھی ہیں، اُن کے متعلق بھی ارشاد فرماتے ہیں۔

حضرت حق سبحانہٗ تعالے باکمال رافت و رحمت خود بندہ را بہ مجرد عقل کہ مجال خطاء و غلط در وے بسیار ست بے آنکہ ابلاغ مبین بہ توسط انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات فرمایند در آتش مخلد سازد و عذاب گرفتار سازد۔

اپنی انتہائی رحمت و مہربانیوں کی وجہ سے اللہ تعالےٰ نے بندوں کو صرف اس عقل کے حوالہ نہیں کیا جس میں غلطی اور صحت دونوں کی گنجائش بہت زیادہ ہے، بلکہ اسی رحمت و رافت کا اقتضا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے پوری پوری تبلیغ کیے بغیر کسی کو آگ کے ابدی عذاب میں گرفتار نہ کرے۔

حضرت مجددؒ فرماتے ہیں کہ باوجود عقل و ہوش کے جن لوگوں تک دین اور دین کے پیش کرنے والے پیغمبروں کا علم صحیح طور پر نہیں پہنچا، یعنی "ابلاغ مبین" ان کو نہ ہوسکا اُن کے متعلق جہاں یہ فیصلہ دشوار ہے کہ وہ جہنم کے ابدی عذاب میں گرفتار ہوں

Marfat.com

اسی طرح فرماتے ہیں۔

گراں است حکم کردن او را باوجود شرک بخلود جنت۔

ان لوگوں کے متعلق (جنہیں پورے طور پر پیغمبروں کے پیغام کی تبلیغ نہیں ہوئی) یہ فیصلہ بھی دشوار ہے کہ باوجود مشرک ہونے کے اُن کو جنت کی ابدی زندگی کا حق قرار دیا جائے۔

مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا کشفی حل

پھر اس دشواری کو پیش کرتے ہوئے کہ اس قسم کے لوگوں کے متعلق نہ دوزخی ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ جنتی ہونے کا ایک کشف پیش فرماتے ہیں۔

بعد از مدتِ مدید عنایت خداوندی جل سلطانہ رہنمونی فرمودہ حل ایں معما نمود و منکشف ساخت کہ جماعہ نہ در بہشت مخلد خواہند بود نہ در دوزخ بلکہ بعد از بعث و احیاء اخروی ایشاں را در مقام حساب داشتہ باندازۂ جرم معذب خواہند ساخت و استیفائے حقوق نمودہ در رنگ حیوانات غیر مکلف ایشاں را نیز "معدوم مطلق" "ولاشئ محض" خواہند فرمود۔

زمانہ دراز کے بعد اللہ سبحانہ جل سلطانہ کی عنایت نے میری رہنمائی فرمائی اور اس معمہ کا حل مجھ پر منکشف کیا گیا کہ انسانوں کا ایک گروہ جنت میں نہ ہمیشہ رہے گا اور نہ دوزخ کے ابدی عذاب میں گرفتار ہوگا بلکہ ان کو زندہ کرے اور دوبارہ اٹھانے کے بعد حساب وکتاب کے مقام میں انھیں حاضر کیا جائے گا اور ان کے جرم کے پیمانے کے مطابق ان کو عذاب دیا جائے گا

Marfat.com

اور جو حقوق اُن کے ذمہ عائد ہوتے ہیں
اُن کی وصول یابی کرکے اُن حیوانوں اور
جانوروں کے قاعدہ کے مطابق جو
شریعت کے مکلف نہیں ہیں، انسانوں
کے اس طبقہ کو بھی معدوم مطلق اور
نیست محض بنا دیا جائے گا۔

حضرت مجدد اپنے اس کشفی خیال کو درج فرمانے کے بعد آگے اس پہ اور اضافہ فرماتے ہیں :۔

این معرفت غریبہ را چوں در محضر انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات عرضہ نمودہ شد ہمہ تصدیق آں فرمودند و مقبول واشتند والعلم عند اللہ سبحانہ ۔

اپنی اس نادر معرفت کو پیغمبروں اور انبیاء علیہم السلام کی مجلس میں پیش کیا گیا سبھوں نے میرے اس خیال کی تصدیق فرمائی اور سبھوں نے قبول کیا ۔ اور صحیح علم تو اللہ سبحانہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے ۔

جس کا حاصل یہی ہوا کہ نئی نوع انسانی کے متعلق جو یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ اُن کی صرف دوہی قسمیں ہیں، ابدی جنتی اور ابدی دوزخی، اس خیال کے بالمقابل حضرت مجدد ایک تیسری قسم بھی پیش کرتے ہیں جنہیں اُن کے خیال میں یا اُن کے کشف کے مطابق حیوانی مجازات کے بعد :۔

ایشاں را نیز معدوم مطلق ولاشی

اُن کو بھی نیست محض اور لاشی مطلق

Marfat.com

محض خواہند فرمود۔ کر دیا جائے گا۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک کشفی خیال ہے، اور عقائد کا مسئلہ ہے کہ اس باب میں کشف حجت نہیں ہے، اگرچہ حضرت مجدد نے حضرت انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات سے بھی اس کی توثیق حاصل فرمائی ہے، لیکن یہ توثیق بھی تو کشفی ہی ہے غالباً اسی لیے مجدد صاحب نے والعلم عند اللہ سبحانہ کے الفاظ کا اضافہ اس جگہ فرمایا ہے۔ نیز علماء ظاہر اپنے اصول پر شاید یہ پوچھ سکتے ہیں کہ خود حیوانی مجازات (یعنی جانوروں میں مظلوم کا ظالم سے بدلہ لینے کا مسئلہ کسی قطعی الدلالۃ قطعی الثبوت دلیل سے کب ثابت ہے؟ بعض روایتوں میں جن کی سند بھی قابلِ تنقید ہے، اس کا ذکر بے شک آیا ہے مگر ظاہر ہے کہ علماء کے لیے اعتقادی مسائل میں اس قسم کی روایتیں قابل حجت نہیں ہو سکتیں، خلاصہ یہ ہے کہ غیر مکلف حیوانوں پر اگر اس قسم کے غیر مکلف انسانوں کو قیاس کیا جائے تو علاوہ کشف کے ایک قیاسی وجہ بھی پیدا تو ہوتی ہے لیکن جس پر قیاس کیا جائے خود اس کا مرتبہ ایسا نہیں ہے جسے عقیدہ کا مقام عطا کیا جائے۔

قرآن مجید کا عجیب اشارہ

البتہ اگر سورۂ فاتحہ کی آخری آیتوں پر غور کیا جائے یعنی

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

راہ اُن لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا، نہ اُن کی جو غضب میں مبتلا کیے گئے اور نہ گمراہوں کی۔

تو منجملہ اور پہلوؤں کے ایک کھلا ہوا یہ پہلو پیدا ہوتا ہے کہ ایک گروہ تو

Marfat.com

اُن لوگوں کا ہے جن پر خدا کا انعام ہوا یعنی جو جنت کے مستحق ہیں - دوسرا گروہ جن پر غضب کیا گیا، یعنی جہنم جن کا ٹھکانا ہوگا، آگے " ولا الضالین " کی صفت ہے یعنی سیدھی راہ جنہیں نہ مل سکی اور بھٹک گئے — قرآن میں ضلالت (گم گشتگی راہ) کا اطلاق بظاہر دو حالات پر کیا گیا ہے - کبھی تو اس کا انتساب اُن لوگوں کی طرف کیا گیا ہے جن کی حق تعالیٰ نے سزا کے طور پر راہ مار دی، جیسے سزا کے طور پر قلوب پر ختم کر دیا جاتا ہے - سمع و ابصار پر " غشاوہ " اور غلاف چڑھا دیا جاتا ہے گویا ایسی مثال ہوئی کہ مثلاً بادشاہ کسی پر خفا ہوتا ہے اور اس کی آنکھیں نکلوا لیتا ہے تو جیسے بیرونی حاسوں سے محروم کر کے کبھی سزا دی جاتی ہے یوں ہی قدرت بعضوں کے اندرونی احساسات کو باطل کر کے اُسے اپنی سرکشی اور طغیان کی سزا چکھاتی ہے سورہ لبقر کی ابتدائی آیات میں اہل نفاق کے متعلق ذکر ہے کہ

فزادھم اللہ مرضاً ولھم	بڑھا دیا اللہ نے ان کو بیماری میں اور
عذاب الیم بما کانوا	ان کے واسطے دردناک سزا ہے اس
یکذبون ط	وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے -

جھوٹ بولنے کی سزا بس دل کے روگ اور قلب کے مرض میں اللہ تعالیٰ اضافہ فرماتے ہیں، جو ظاہر ہے کہ باطنی احساسات کی بربادی ہی کی سزا ہے -

بہرحال " ضلالت " اور گمراہی کی ایک تو سزائی شکل ہے دوسری شکل قرآن ہی سے " ضلالت " ہی کی یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہدایت کی راہ کسی کو نہ مل سکی، سب جانتے ہیں کہ وحی سے پہلے خود صاحب نبوت کبریٰ کے اس حال

Marfat.com

کی تعبیر بھی قرآن میں "ضلالت" ہی سے فرمائی گئی ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى — اور پایا (اللہ نے) تجھے ضال (گم کردہ راہ)، پس اُس نے ہدایت کی (یعنی وحی سے سرفراز فرمایا)

اور یہ کوئی جرم نہیں ہے، بلکہ ہدایت کے اسباب کے فقدان کا یہ قدرتی نتیجہ ہے جب تک وحی کے ذریعہ سے ہدایت کی راہ نہ کھولی جائے آخر اُس حال کی تعبیر اُس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ راستہ تمہارے سامنے نہ تھا اگر راستہ رہتا تو پھر وحی سے کون سی راہ کھولی گئی، بہر حال یہ ایک کھلی ہوئی صاف بات ہے، راستہ جب سامنے نہ تھا تو یہ کیسے کہہ دیا جاتا ہے کہ تمہارے سامنے راہ تھی پس فضول اور دور از کار تاویلوں کی قطعاً حاجت نہیں ایک واقعہ کا اظہار ہے۔

اب ظاہر ہے کہ سورۂ "الحمد" میں جب انعام والوں کا بھی ذکر ہو چکا اور غضب والوں کا بھی تو تیسرا اگر وہ وہی ہو سکتا ہے جو اُن دونوں سے کچھ اپنی جداگانہ نوعیت رکھتا ہو، بخاری میں بھی، المغضوب علیھم کا یہود کو اور الضالین کا نصاریٰ کو مصداق قرار دیتے ہوئے اس کی توثیق کی گئی کہ دونوں ایک نہیں ہیں، پس وہ ضلالت جو غضب کا نتیجہ ہو سکتی ہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے یہ وہ ضلالت نہیں ہے بلکہ اس سے یہ کوئی علیحدہ چیز ہے یعنے یہی بات کہ اسباب ہدایت کے فقدان کی وجہ سے جنہیں راستہ نہ مل سکا، خواہ اب راہ نہ ملنے کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ اُس راہ تک رسائی کے لیے جس خارجی

Marfat.com

سازو سامان کی ضرورت ہے وہ مہیا نہ ہو سکا، جیسا کہ مجدد صاحب نے فرمایا کہ:۔

بے آنکہ ابلاغ مبین بہ توسط انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات فرمائند — پیغمبروں سے پوری کامل تبلیغ کے بغیر (خدا کی رحمت) کسی کو ابدی عذاب میں مبتلا نہیں کرتی۔

وہ بے چارہ جو کسی ایسے ماحول میں گرفتار ہے کہ حق اُس تک نہ پہنچ سکا یا وہ حق تک نہ پہنچ سکا — یا راہ اس لیے نہ مل سکی کہ حق تک پہنچنے کے لیے جس عقل و فہم یا حواس کی سلامتی کی ضرورت ہے اُس کے پاس نہ تھی، مثلاً وہی لوگ جن کا ذکر روایتوں میں آیا ہے کہ قیامت کے دن وہ عذر خواہ ہو کر آئیں گے، کہ میں نپٹ بہرا تھا، یا مجھے اتنی عقل ہی نہیں دی گئی تھی جو دین کو سمجھتا، یا پانے کے بعد بڑھاپے یا مرض کی وجہ سے عقل اس کی غائب ہو گئی، مثلاً مجانین یا کھوسٹ خرف بڈھوں کا جو حال ہو جاتا ہے یا عقلی نشو ونما کا وقت ہی اس کو نہ مل سکا اور بچپن ہی میں مرگیا۔

ظاہر ہے کہ نسل انسانی میں شریک ہونے کے باوجود یہ سارے طبقات بنی آدم کے ایسے ہیں جنہیں راہ نہ مل سکی یعنی الضالین کے یہ مصداق ہیں، پس میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حضرت مجدد کے پیش کردہ بیان کے متعلق علماء ظاہر کا یہ خیال کہ وہ صرف کشفی ہے اگر سورہ فاتحہ کے اُن الفاظ پہ غور کیا جائے تو غالباً کشف سے اس کا درجہ کچھ آگے بڑھ جاتا ہے اور ایک گروہ ایسا قرآن ہی سے نکل آتا ہے، اس کی پہلی سورۃ سے نکل آتا ہے جن کے متعلق قرآن نہ انعام کی تصریح کرنا چاہتا ہے اور نہ غضب کی، اور یہ ایک تیسری قسم انسانوں کی پیدا

Marfat.com

ہوتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کسی معدوم کو بغیر کسی استحقاق کے صرف موجود کرنا موجوُد کی نعمت اور لذت سے سرفراز فرمانا خواہ وہ ایک سکنڈ ہی کے لیے کیوں نہ ہو احق تعالےٰ جل مجدہٗ کا ایسا انعام ہے جسے اُن کے سوا آسمان وزمین کی کوئی طاقت کسی کو عطا نہیں کر سکتی، سائنس اور کیمیا کے ہوش ربا ایجادات صرف اُن صلاحیتوں کا پتہ چلا سکتے ہیں جو قدرت نے اشیاء میں ودیعت فرمائی ہیں، لیکن میں کہہ چکا ہوں کہ ایجاد (وجود بخشنا) یہ انسان کے بس سے باہر ہے پانی اور ہوا کے جراثیم جن کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ منٹوں میں پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں، یا مکھیاں جو ایک ہی ہفتہ میں دادی پر دادی تک کی پشتوں تک پہنچ جاتی ہیں اور یوں ہی ایک نسل آتی رہتی ہے[1] جاتی رہتی ہے ان مکھیوں یا حشراتی حیوانات میں اعضاء

---

[1] مرتی رہتی ہیں اور جیتی رہتی ہیں" بجائے ان الفاظ کے میں نے قصداً آتی جاتی رہتی ہیں کے الفاظ استعمال کیے اس لیے کہ بجز ان حیوانات کے جو انسی کہلاتے ہیں یعنی آدمی سے اُن کا ملکی تعلق پیدا ہوگیا ہے یہ سوال نہایت پیچیدہ ہے کہ حیوانات کی پیدائش کا جو اوسط ہے اس کے حساب سے چاہیے تھا کہ دنیا اُن میں سے کسی ایک ہی حیوان سے بھر جائے لیکن جب سے دنیا قائم ہے، پرندوں اور وحشی حیوانات وغیرہ کی ایک خاص تعداد ہے جو زمین پہ پائی جاتی ہے حشرات بھی موسمی حالات کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے، مچھروں، پتنگوں کھٹملوں کی خاص موسم میں کثرت ہو جاتی ہے، پھر یکایک معلوم ہوتا ہے کہ غائب ہوگئے

Marfat.com

کا باضابطہ نظام ہوتا ہے، اُن میں باصرہ، شامہ، سامعہ ہر قسم کے حواس بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں، سال، ماہ، ہفتہ، دن، گھنٹہ، منٹ، سکنڈ، جتنی دیر کے لیے بھی ان نعمتوں سے لذت اندوزی کا اُن کو موقعہ ملتا ہے بلاشبہ دینے والے کا یہ صرف احسان ہی احسان ہے، وجود اور ہستی فطرت کا ایک ایسا مطالبہ ہے کہ پانی کی جونکوں، اور کیچوؤں تک کی یہ حالت ہے کہ ایک زندہ کھال کے سوا اُن کے پاس وجود کا کوئی سرمایہ نہیں ہوتا، لیکن اپنی حد تک حفاظت خود اختیاری میں سارا زور ایسی چیزیں بھی لگا دیتی ہیں، ایک بیما

(حاشیہ بسلسلہ صفحہ ۲۱۰) آدمی رات دن زمین پہ چلتا پھرتا ہے جھاڑو دیتا ہے لیکن ان چیزوں کی لاش طبعی موت والی نہیں ملتی، گویا چڑیا جو بارہ مہینے گھروں میں رہتی ہے ایک اوسط تعداد ان کی پائی جاتی ہے لیکن جس نسبت سے اُن کے توالد تناسل کا سلسلہ جاری رہتا ہے پھر یا یہ ہوتا کہ گھروں میں اس چڑیا کے سوا کچھ نہ ہوتا یا ہر روز جھاڑو دینے میں بیسیوں لاشیں طبعی موت سے مرنے والی چڑیوں کی ملتیں وہ نہ ملتیں تو اُن کے پر اُن کے کچھ ایسے اجزا جنہیں نہ بلیاں کھاتی ہیں نہ دوسرے جانور لیکن گھروں میں ہو یا جنگلوں میں پھلوں کا انبار ملتا ہے۔ آم کے زمانہ میں آموں کے ڈھیر ٹپکے ہوئے ملتے ہیں حالانکہ اُن کے کھانے والے زیادہ ہیں لیکن پرندوں یا جنگلی جانوروں کی طبعی موت کی لاشوں کا پتہ آج تک کسی نے نہیں دیا یہ کیا قصہ ہے واللہ اعلم بالصواب ان کے وجود و عدم کا کیا قانون ہے وَمَا یَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّکَ اِلَّا ھُوَ۔

Marfat.com

بسترِ مرگ پہ آخری حالت میں ہوتا ہے لیکن جس قیمت پہ بھی چند سانسوں کے لینے کا موقع اُسے ملتا ہے اپنی اپنی حد تک کوئی کمی نہیں کرتا، پس بقول حضرت مجدد اگر بعض انسانی افراد بجائے جنت اور دوزخ کے معدوم محض کر دیے جائیں گے تو یقیناً حق تعالیٰ نے دنیا میں اُن کو جینے کا اور موجود ہونے کا جتنا بھی موقع دیا صرف انعام ہی انعام، رحمت ہی رحمت ہے، ایسی رحمت کہ اگر کسی طبیب کے متعلق کسی کو معلوم ہو جائے کہ وہ مقررہ وقت سے ایک دن یا دو دن آدمی کی موت ٹال دیتا ہے، تو خدا ہی جانتا ہے کہ اُس کے قدموں پہ دولت کی کتنی مقدار نثار ہو، پھر چند دنوں کی زندگی کی اگر یہ قیمت ہے، تو جن لوگوں کو بیرونی یا اندرونی موانع کی وجہ سے سیدھی راہ نہ مل سکی اگر دنیا میں وجود اور وجود کے لوازم کی نعمتوں سے متمتع ہو کر دوسری زندگی میں دینے والا اُن کو ابدی زندگی نہ عطا کرے تو جہاں لاکھوں اور کروڑوں جراثیم، حشرات، پرند، چرند، درند جانداروں کے ساتھ قدرت کا یہ سلوک سراسر فضل و احسان ہے وہیں ان چند انسانوں کے ساتھ بھی اگر یہی برتاؤ کیا جائے تو اس کے فضل و کرم میں اس کا شمار بھی کیوں نہ ہوگا، اور سچ تو یہ ہے کہ جہنم کے عذاب سے بچا لینا یہ خود ارحم الراحمین کی کیا کم رحمت ہے، اور وہ سطحی وسوسہ جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ نے اُن لوگوں کو بھی عقل یا زندگی یا حواس وغیرہ کا وہی حصہ کیوں نہ عطا کیا۔ یہ ایسی بات ہے کہ اللہ میاں سے ساری انسانیت اس لیے بگڑ بیٹھے کہ آپ نے ہمیں اپنی جیسی قوت و قدرت کیوں نہ عطا کی، خود تو خدا بنے ہوئے ہیں، اور ہمیں خدا نہ بنایا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ بلا استحقاق وجود کا جتنا حصہ بھی جس

Marfat.com

کسی کو ملا ہے صرف فضل ہی فضل ہے۔

البتہ حق تعالےٰ سے اس کی دعا ضرور کرنی چاہیے کہ پروردگارا جب آپ نے بجائے حیوانات کے مجھے انسانی نسل میں پیدا فرمایا، اور یہ صرف آپ کا فضل ہے، تو اسی کے ساتھ ان لوگوں میں مجھے نہ بنا، جنھیں انسانی توانائیوں سے سرفراز ہونے کے بعد بھی ان توانائیوں کی قیمت حاصل کرنے اور نرخ بڑھانے کا موقع نہ مل سکا، کہ پیدا ہوئے آدم کے گھرانے میں لیکن حشر ہوا جانوروں کے مانند۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں دعا مانگی ہی جاتی ہے۔ اس بات کی کہ انسانیت کو وہ راہ دکھائی جائے جس پر چل کر وہ اپنی ممکنہ صلاحیتوں کی قیمت حاصل کر سکے، یعنے وہی جس کی تعبیر قرآن نے انعام سے کی ہے، اور جس کا ظہور الجنتہ ورضوان اللہ کی شکل میں ہوگا۔

اب اس کے بالعکس دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں، یعنی راہ سامنے آجائے معلوم بھی ہو جائے کہ انسان کا نرخ جس راہ پہ چلنے سے مسلسل بڑھتا چلا جاتا ہے وہ یہی ہے لیکن جان بوجھ کر بغاوت وطغیان کی راہ اختیار کر کے غضب الٰہی کا آدمی (العیاذ باللہ) مورد بن جائے، یہ تو پہلی صورت ہوئی اسی حال کو قرآن نے المغضوب علیہم کے الفاظ میں ادا کیا ہے دوسری صورت یہ ہے کہ کسی اندرونی یا بیرونی رکاوٹ کی وجہ سے آدمی کے سامنے راہ ہی نہ آسکی۔ ظاہر ہے کہ صراط مستقیم کی درخواست دینے والے کے لیے ناگزیر ہے کہ ان دونوں شکلوں سے پناہ مانگے، اور یہی دعا حق تعالےٰ نے اپنے بندوں کو سکھائی ہے۔

Marfat.com

باقی یہ مسئلہ کہ صراط مستقیم سے محروم ہونے والوں کی ان دونوں قسموں کے ساتھ حق تعالیٰ کا برتاؤ کیا ہوگا، اُن میں سے ایک کا حال تو قرآن نے بیان کر دیا کہ غضب الٰہی اُن سے متعلق ہوگا اور عہد نبوت میں یہ حال اُن یہودیوں کا تھا جنہیں مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے تجربہ کرنے کا براہِ راست کھُلا ہوا موقع ملا۔ اور جان بوجھ کر انھوں نے کفر کی راہ اختیار کی، نصاریٰ عموماً نہ مکہ میں تھے نہ مدینہ میں، بلکہ اُن کی تعداد زیادہ تر بیرون عرب میں تھی، یا عرب کے دُور دست علاقوں میں تھے، کچھ بھی ہو بہود مدینہ کو تجربات کے جو مواقع میسر آئے وہ عموماً نصاریٰ کو نہ تھے اس لیے اگر بخاری میں عہد نبوت کے ان دو فرقوں میں سے ایک کو مغضوب علیہم اور دوسرے کو الضالین کے تحت داخل کیا گیا۔ تو ان الفاظ کی یہ اچھی توضیحی مثال ہوسکتی ہے۔

بہرحال نہ راہ پانے والوں میں ایک طبقہ کا مغضوب علیہم ہونا تو بدیہی ہے اب رہا دوسرا طبقہ اُس کا انجام کیا ہوگا، قرآن نے اس کی تصریح نہیں کی۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا تحقیقی بیان

غالباً ترمذی کا درس ہو رہا تھا، حلقہ درس میں ایک دیوانہ بھی تھا، اُس نے ایک خاص وجہ سے جس کا تعلق ایک وقتی مسئلہ سے تھا، کچھ اسی نوعیت کا سوال کیا، جواب میں حضرت الاستاذ قدس سرہ نے جو بات ارشاد فرمائی تھی، اُس وقت تو اُس کی قیمت کا اتنا اندازہ نہ ہوا لیکن جب جنون کے چند میدان اور طے ہوئے، تب وہ بات یاد آئی، اور وہی اس معمہ کا اس فقیر کے نزدیک آخری حل ہے۔ ارشاد ہوا کہ تبلیغ کے مراتب بھی متفاوت

Marfat.com

ہیں، ایک تبلیغ ابوبکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو ہوئی ایک تبلیغ مثلاً عام صحابیوں کو ہوئی، پھر یوں ہی تابعین تبع تابعین کو ہوتی ہوئی، مثلاً ہم جیسوں تک پہنچی، بلاشبہ ہمیں بھی تبلیغ ہوئی لیکن جیسی ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے رفقاء کار کو ہوئی ہماری تبلیغ کی نوعیت وہ نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ایمان والوں کا حال ہوا۔ پھر جنہوں نے انکار کیا، اُن میں ایک انکار ابوجہل کا ہے اور ایک انکار فرض کرو کہ ہندوستان کے کسی دیہاتی ہندو گنوار کا ہے۔ ظاہر ہے کہ تبلیغ کے لحاظ سے دونوں کا درجہ بھی ایک نہیں ہے — یہ تو پہلا مقدمہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ — مواخذہ الٰہی کے مراتب بھی متفاوت ہیں، یعنے جس درجہ کی تبلیغ جس کسی کو ہوئی ہے اُسی درجہ کا مواخذہ بھی اس سے ہوگا۔

فرمایا گیا کہ بس کلیہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جیسے جس درجہ کی تبلیغ ہوگی مواخذہ الٰہی بھی اسی درجہ کا اس کے ساتھ متعلق ہوگا اور اسی لحاظ سے اس کی گرفت بھی ہوگی — یہ تو کلیہ ہوا، لیکن جزئیات پہ اس کلیّہ کو کیسے منطبق کیا جائے یعنی تشخصی طور پہ یہ بتانا کہ کسے کس درجہ کی تبلیغ ہوئی، اور اس کا مواخذہ کس درجہ کا ہوگا، ظاہر ہے کہ دونوں (یعنی تبلیغ و مواخذہ الٰہی دونوں) کے مراتب لامحدود ہیں، اس کا متعین و مشخص علم حق تعالےٰ ہی کو ہو سکتا ہے اور ان ہی کا علم فیصلہ کے لیے کافی ہے ہمیں صرف اتنا ماننا چاہیے کہ جیسی تبلیغ ہوگی گرفت و مواخذہ بھی اسی کے مطابق ہوگا، یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص یورپ میں ہو، اس نے تحقیق و تلاش کے ذریعہ سے تبلیغ میں اپنا درجہ اُونچا کر لیا ہو، اور

Marfat.com

ایک شخص مسلمانوں ہی کے درمیان رہتا ہو، مثلاً ہندوستان کے سینکڑوں ہندو وغیرہ اقوام کا حال ہے کہ ان پہ جہل و غفلت طاری ہے پس خدا ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس کو کس درجہ کی تبلیغ ہوئی البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ تبلیغ کے جس درجہ تک پہنچ کر اُس نے انکار کیا ہے اسی لحاظ سے اس کی پکڑ ہو گی۔

ظاہر ہے کہ تقریباً اٹھائیس اُنتیس سال کی یہ بات ہے، بجنسہٖ الفاظ تو میں نے حضرت کے ادا نہیں کیے ہیں، لیکن انشاء اللہ مفہوم یہی تھا۔ اُس حلقۂ درس کے رفقا اگر دنیا کے کسی حصہ میں موجود ہوں گے تو وہ اس کی شہادت ادا کر سکتے ہیں۔

کچھ بھی ہو، بات یقیناً پختہ ہے اور آخری بات اس سلسلہ میں جو کہی جا سکتی ہے وہ انشاء اللہ یہی ہو سکتی ہے، حضرت مجدّد کا کلام مجھے بعد کو ملا، اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر سہ گانہ کی طرف بھی ذہن بعد کو منتقل ہوا، افسوس ہوا کہ اُس وقت یہ چیزیں سامنے ہوتیں تو حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے کچھ اور مزید استفادہ کا موقعہ ملتا، لیکن طالب علمی کے معلومات ہی کیا ہو سکتے تھے یہی غنیمت ہے کہ سوال کر سکا۔ اور جواب کسی نہ کسی طرح دماغ میں محفوظ رہا جو آج بحمد اللہ کام آیا۔ مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ آج کل پیدا ہو گیا ہے، جس کے دل میں یہ سوال آتا ہے۔ انشاء اللہ تعالےٰ حضرت الاستاذ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب ان کی تشفی کر دے گا۔

ایک اور مسئلہ اگرچہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے کلیہ سے التزاماً یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ جسے بالکل تبلیغ نہ ہو سکی، مواخذہ کا بھی

Marfat.com

اس سے تعلق نہ ہوگا۔ لیکن اتنی بات یاد نہیں رہی کہ حضرت نے اس کی تصریح بھی فرمائی تھی یا نہیں، لیکن مواخذہ نہ ہوگا تو پھر باوجود نسل انسانی میں ہونے کے اُن کے ساتھ معاملہ کیا ہوگا۔ مثلاً بچپن ہی میں جن کا انتقال ہوا۔ یا جو معتوہ و مجنون ہیں، یا مادرزاد بہرے ہیں؟ احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ قرآن نے الضالین کے ساتھ جب انعام اور غضب دونوں کو متعلق نہیں کیا، لیکن اسی کے ساتھ قدرت اُن کے ساتھ کیا کرے گی اس سے بھی خاموشی اختیار کی گئی ہے، اس لیے ہم بھی خاموش ہو جائیں، خدا کے بندوں کو خدا کے حوالہ کر دیں اوروں کے متعلق تو نہیں مگر اور مشرکین کے متعلق امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ وہ توقف یعنی خاموشی کے مسلک کو پسند کرتے تھے ہم اسی پہ دوسرے غیر مکلفین کو قیاس کر سکتے ہیں، لیکن مجدد الف ثانی نے صراحت کے ساتھ دوبارہ تصریح کی ہے کہ غیر ذمی کفار کی اولاد ہو، یا مشرکان زمان فترۃ۔

فحکمهم حکم البهائم من الاعدام بعد البعث النشور استیفاء للحقوق۔

ان کا حکم جانوروں کا حکم ہے یعنی حقوق کی تکمیل کے لیے دوبارہ اٹھانے اور زندہ کرنے کے بعد وہ معدوم کر دیے جائیں گے۔

البتہ دار الاسلام کے مشرکین و کفار کی اولاد کے متعلق مجدد صاحب کا خیال ہے کہ وہ جنتی ہوں گے۔ کیونکہ اہل ایمان کے نابالغ بچوں کے متعلق تو سب کا اتفاق ہے کہ وہ جنتی ہوں گے، اس لیے کہ مکلف ہونے سے پہلے اُن کی

Marfat.com

جنبیت تو ماں باپ کے جنس کی ہے ظاہر ہے کہ مومن خود تو جنت میں جائے اور اُس کی ٹانگ اور ہاتھ نہ جائے یہ بے معنی بات ہے، ہاں مکلف ہو جانے کے بعد اُس کی شخصیت منتقل ہو جاتی ہے اور نجات و عدم نجات کا مدار اب اس کے فعل پہ ہوگا، رہے ذمی مشرکین اُن کی اولاد کے جنتی ہونے کا جو مجدد صاحب نے دعویٰ کیا ہے، گو اُن کا یہ بھی کشف ہی معلوم ہوتا ہے لیکن بخاری کی ایک روایت ہے جس میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے (معراج) کے واقعہ میں حضرت ابراہیم کے اردگرد بچوں کو پایا؟ صحابہ نے پوچھا کہ کیا مشرکین کی اولاد بھی؟ آپ نے فرمایا "اولاد المشرکین[1]" ظاہر ہے کہ اس میں ذمی غیر ذمی کا

---

[1] اس موقع پہ شاید اس پر تنبیہ مناسب ہے کہ بخاری کی اس روایت کے باوجود بعض خشک مزاج مولوی روایتوں کی سند کی تنقید کے بغیر محض اس لیے کہ عوام میں مشہور ہے۔ عموماً ایسا پہلو اختیار کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ کسی کی مغفرت کرنا چاہتے بھی ہیں تو انھیں کچھ گرانی سی ہوتی ہے یہی اولاد مشرکین کا قصہ ہے، ایک روایت عوام میں ایسی بھی مشہور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین کی اولاد کا اپنے ماں باپ کے جیسا حشر ہوگا۔ یعنی وہ بھی دوزخی ہیں، مجھے ڈر ہے کہ کوئی مولوی صاحب اس روایت کو لے کر میری طرف نہ دوڑیں، اس لیے اُن کو مطلع کرتا ہوں کہ حافظ ابن عبدالبر جیسے ناقد بصیرت نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے:-

" فی سندہ وھن ضعف " مع انھا مخالفۃ للاصول الکلیۃ لا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخریٰ -۱۲

Marfat.com

فرق نہیں ہے لیکن کشف مجددی کے ایک حصہ کی اس سے تائید ہوتی ہے، یوں خدا کی جنت ہے جسے چاہے داخل کرے اور سچی بات تو یہی ہے کہ خدا کی جنت اور خدا کی دوزخ کی داروغگی کا چارج خود بخود اپنے ہاتھ میں لے کہ کسی کے جنتی اور کسی کے دوزخی ہونے کا فیصلہ غالباً ....

.... ایک ایسے آدمی کے لیے جسے اپنے فیصلہ کی خود خبر نہ ہو، شاید پسندیدہ فعل نہ ہو، کم از کم میرے ذاتی مذاق پہ یہ بات سخت گراں تھی، اسی لیے ان مباحث میں الجھنا بھی پسند نہیں کرتا، لیکن کیا کیجیے کہ اس زمانہ میں ان ہی جزئیات کو حربہ بنا کر آج اسلام کے متعلق دلوں میں غیر شعوری تکذیب پیدا کرنے کی کوشش مختلف سمتوں سے ہو رہی ہے، کبھی دور افتادہ جزائر کے باشندوں کو پیش کیا جاتا ہے، کبھی کول، بھیل جنگلی اقوام کا نام لے کر پوچھا جاتا ہے کہ اسلام نے ان لوگوں کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے، ناواقفوں کو کچھ ایسا باور کرایا گیا ہے کہ اسلامی ذخائر اور اسلامی علماء کے سامنے گویا یہ سوالات تھے ہی نہیں اور عصری ذہانتوں کی یہ کوئی نئی اپج ہے حالانکہ بات کچھ نہیں ہے لیکن عمومیت نامہ کا دعویٰ اسلام کی طرف سے جو پیش کیا جاتا ہے اس دعوے کو مجروح کرنے کے لیے ان ہی ملکوں اور سطحی باتوں سے ناجائز نفع اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے، ٹھیک اس کی مثال ایسی ہے کہ ارض سبعین یا قطب شمالی وجنوبی کے باشندوں کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ گویا اس زمانہ سے پہلے لوگوں کو اس کا علم نہ تھا کہ زمین کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جہاں دن اور رات کی مقدار اقالیم معتدلہ کے حساب سے بہت زیادہ طوالت

Marfat.com

اختیار کر لیتی ہے، حتیٰ کہ چھ چھ مہینوں کی رات اور دن کی صورت بھی پیش آجاتی ہے، پوچھا جاتا ہے کہ ان مقامات کے باشندے وقتی عبادتوں کو کس طرح ادا کریں گے، ان کی پانچ وقتوں کی نمازوں یا مہینہ بھر کے روزوں، جمعہ، عیدین وغیرہ کا کیا حساب ہوگا؟

اس جہل کا کیا ٹھکانہ ہے، اسلام میں جو مسئلہ آج سے ہزار سال پہلے طے ہو چکا ہے اور صحیح حدیث کی روشنی میں طے ہو چکا ہے، یعنی مقصود ان عبادتوں سے صرف بندوں اور خدا کے تعلق کی تصحیح ہے، ضبط و نظم کو قائم کرنے کے لیے اوقات مقرر کر دیے گئے ہیں کہ اصل مقصد کے حصول میں اس سے زیادہ مدد ملتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حکم ان ہی مقامات تک محدود رہے گا جہاں ضبط و نظم کے اُن ذرائع سے نفع اٹھایا جا سکتا ہو لیکن جہاں اس کا امکان نہ ہو تو ذرائع کے لیے اصل مقصد کو کیسے چھوڑا جا سکتا ہے، نماز کے ادا کرنے کی طہارت و صفائی کے ساتھ یہ صورت مقرر کی گئی ہے کہ آدمی اگر جنابت کی حالت میں ہو، تو غسل کرے اور یوں وضو کر کے نماز پڑھا کرے، لیکن سرے سے اگر کہیں پانی نہ ملے تو کیا صرف اسی لیے کہ پانی نہ ملا، انسان کا جو فرض ہے یعنی ذکر اللہ میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ صرف کرنا کیا اس سے وہ مستثنیٰ کر دیا جائے گا؟

اسلام نے حکم دیا کہ پانی نہ ملے تو غسل کی ضرورت ہو یا وضو کی ہر حال میں تیمم کر کے اصل مقصد کو ادا کرنا چاہیے۔

اسی طرح کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکتے ہو، تو بیٹھ کر نماز پڑھ لیا کرو۔ بیٹھ کر ممکن نہ ہو، تو اشاروں سے ذکر اللہ کے فرض کو ادا کرو، الی اصل ذرائع

Marfat.com

کی وجہ سے ظاہر ہے کہ اصل مقصد کو ترک نہیں کیا جا سکتا، دستر خوان یا برتن، رکابی کٹورے اگر نہ مہیا ہو سکیں تو آدمی کھانا چھوڑ نہیں سکتا، یہی حال اوقات کا بھی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قرب قیامت میں اوقات کا نظام بدل جائے گا، اور ایک ایک دن چالیس دنوں کے مساوی ہو گا، تو نمازیں کیوں کر پڑھی جائیں؟ تو صحیح حدیث ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اندازہ کر لیا کرنا یعنی چوبیس گھنٹوں میں پانچ دفعہ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اللہ کو یاد کر لیا کیجیو، یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں تمام وقتی عبادتوں کا حل چھپا ہوا ہے، مدت ہوئی کہ فقہاء اسلام اسی حدیث کی روشنی میں اس فتوے سے فارغ ہو چکے، بحمد اللہ آج تک فن لینڈ جیسے مقامات تک میں مسلمانوں کی مسجدیں موجود ہیں، جہاں معتدل اقالیم کے اوقات کا جو نظام ہے باقی نہیں رہتا، اور ان مسجدوں میں صدیوں سے اسی فتوے کی بنیاد پر عمل درآمد جاری ہے لیکن ایک فیصل شدہ مسئلہ کو بار بار اُٹھایا جاتا ہے، اور ان قوموں کی اغوائی کوششوں کے ذریعہ سے اُٹھایا جاتا ہے، جو خود بھی مذہب رکھتی ہیں، اُن کے مذاہب میں بھی وقتی عبادات ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے مذہبی سوالات کی جوابدہی کی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہی ذمہ دار ہے، یوم السبت والے یہودی اور اتوار والے عیسائی اور شمسی و قمری تحویلات میں برت منانے والے ہندو، نوروز و مہرجان والے پارسی، ان میں سے کسی کی طرف یہ سوالات گویا عاید ہی نہیں ہوتے!! سچ تو یہ ہے کہ سوال ان قوموں کی طرف اسی لیے عاید نہیں ہوتا کہ اُن کے پاس اس کا جواب ہی نہیں ہے، مگر بحمد اللہ اسلام اپنے پاس ان سوالات کے

Marfat.com

جوابات رکھتا ہے، اسی لیے اس سے پوچھا بھی جاتا ہے اسی سلسلہ میں تبلیغ کی نسبت سے افرادِ انسانی کی ان استثنائی حالتوں کا بھی سوال تھا، ظاہر ہے کہ سوال تو ہر اس قوم کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو بنی آدم کو دین اور خدائی قانون کا مکلّف قرار دیتے ہوئے سزا و جزا کے نتائج کو ان اعمال و افعال پہ عاید کرتی ہے، لیکن جب اُن کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے تو کس بھروسہ پہ سوال اٹھانے کی ہمت ہو، اس لیے دم سادھ لینے ہی میں اپنی عافیت انھیں نظر آتی ہے۔

لیکن آپ دیکھ چکے ہیں کہ صرف منکرین اسلام کی کتابوں ہی میں اس سوال کا جواب موجود نہیں ہے۔ بلکہ خود قرآن، قرآن کی پہلی سورت الفاتحہ ہی میں کہہ دیا گیا تھا جو پوچھا جا سکتا تھا۔ فالحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کے خاتم اور عام و کامل ہونے کی ایک معمولی دلیل یہ بھی ہے کہ اس قسم کے استثنائی سوالات و شاذ و نادر صورتوں کا بھی جواب اس میں موجود ہے ورنہ آخر دوسرے ادیان بھی ادیان ہی تھے، میں نہیں جانتا کہ اُن میں ان سوالات یا ان کے جوابات کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ زیادہ تر اس بحث کے چھیڑنے کی وجہ یہی داعیہ تھا، ورنہ بات اتنی اہم نہ تھی۔

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلُ، وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

Marfat.com

Marfat.com

نفیس اکیڈمی
کراچی

Marfat.com

نفیس اکیڈمی
کراچی

Marfat.com